

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۳۵	اپریل ۱۹۶۳ء	شمار ۴
--------	-------------	--------

ملاحظات

اب کیا ہوگا

میونخ میں جو سمجھوتا ہوا تھا اس کے بعد بعض حضرات کا خیال تھا کہ وسط یورپ میں امن ہو جائے گا (اور اس وقت وسط یورپ میں امن ہو جانا گویا ساری دنیا میں امن ہو جانا ہے) لیکن افسوس ہے کہ یہ توقع بہت کمزور ثابت ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ اس امن و سکون کے لئے مسٹر چرلین وزیر اعظم انگلستان نے اتنی بڑی قربانی پیش کی جو ایک لحاظ سے ”قربانی مسیح“ پر بھی تفوق و امتیاز رکھتی ہے۔ یعنی ایک طرف انھوں نے برطانوی اقتدار کو خاک میں ملا دیا اور دوسری طرف اپنے دیرینہ حلیف فرانس کی ساکھ میں اسے دوسرے درجہ کی حکومت کی سطح پر کھینچ لائے۔ لیکن امن و سکون کی یہ ”دولت مستعجل“ بجلی کی چمک سے زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی اور وسط یورپ پر جنگ کا مہیب دیوتا پھر انگڑائیاں لینے لگا۔

مفاہمت میونخ کے بعد جب ہٹلر کا اقتدار اس حصہ ملک میں قائم ہو چکا جہاں جرمن اکثریت پائی جاتی ہے تو لندن ٹائمز نے نہایت اطمینان کی سانس لیتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ زیکو سلوویکیا پر جو یہ عمل جراحی ہوا ہے وہ غالباً مفید ثابت ہو گا کیونکہ جرمن عنصر متحد ہو جانے کی وجہ سے اب یہ جمہوریت زیادہ اطمینان کے ساتھ ترقی کر سکے گی اور اندرونی بے چینی کوئی باقی نہ رہے گی، حالانکہ ایسا ملک جس کی صنعت و حرفت پر دوسرے قابض ہو چکے ہوں، جس کی اقتصادی خوشحالی دوسرے ملک کی عنایت پر منحصر ہو گئی ہو، جو اپنی مدافعت کرنے کا اہل باقی درکھا گیا ہو اور جس کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا ہو جو ایک حدود درجہ شکست خوردہ و مغلوب ملک کے ساتھ کیا جاتا ہے، کیا خاک زندہ رہ سکتا تھا۔ تاہم وہ برائے نام زندہ تھا، اس کا نام یورپ کے نقشہ میں ایک آزاد جمہوریت کی حیثیت سے نظر آتا تھا۔ لیکن ہٹلر نے آخر کار ہماری طرح کو اس کے بھی ٹکڑے کر دیے۔

آپ زیکو سلوویکیا کا نقشہ دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کا بالائی حصہ تو وہ ہے جہاں پائے تخت پر آگ پایا جاتا ہے، دوسرا درمیانی حصہ سلوویکیا کا ہے اور تیسرا روٹھینیا کا۔ اس سے قبل یہ تینوں حصے ایک ہی جمہوریت میں شامل تھے۔ مفاہمت میونخ کی رو سے بالائی حصہ جہاں جرمن اکثریت ہے، ہٹلر کے اقتدار میں چلا گیا تھا لیکن حکومت بدستور زیکو سلوویکیا کی تھی، اب جرمن نے اس حصہ کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا ہے اور سلوویکیا کے درمیانی حصہ میں جو حکومت قائم ہوئی ہے اس کی حیثیت بالکل جرمن کالونی کی سی ہے اور یہاں کا پریسیڈنٹ ہٹلر ہی کا مقرر کیا ہوا ہے۔ رہ گیا تیسرا حصہ (روٹھینیا) سودہ مفاہمت میونخ ہی کے وقت ہنگری کا حصہ قرار پا گیا تھا اور اب تو اس نے ہٹلر کے اشارہ سے باقاعدہ اس پر قبضہ بھی کر لیا ہے۔

الغرض وسط یورپ کے نقشے سے زیکو سلوویکیا بالکل محو ہو چکا ہے اور اب دول یورپ منظر ہیں کر دیکھئے آئندہ اقدام ہٹلر کا کیا اور کس طرف ہوتا ہے۔ وہ حضرات جنہوں نے میونخ کی گفتگو کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ اب جرمنی قناعت کر کے بیٹھ جائے گا، سخت غلطی کی تھی۔ نازی ذہنیت بڑی حرص چیز ہے اور نازیت کا وجود ہی فتنہ و فساد پر قائم ہے۔ یہ وہ زہر ہلا درخت ہے کہ جب تک اس کی آبیاری انسان کے خون سے نہ کی جائے پھلتا پھولتا نہیں۔ اگر آج جرمنی کے تمام انتہائی مطالبات تسلیم کر لئے جائیں، تو کل وہ اور نئے مطالبات پیش کرے گا، ورنہ اس کی یہ تمام جنگی طیاریاں اور ان طیاروں کے بہانے بیکار ہو جائیں گے۔

جس تدبیر سے ہٹلر نے زیکو سلوویکیا میں کامیابی حاصل کی ہے وہ اس کی نئی تدبیر نہیں ہے وہ ہمیشہ یہی کرتا ہے کہ جہاں جہاں جرمن آبادی پائی جاتی ہے (خواہ وہ کم ہو یا زیادہ) وہاں نازی تحریک کا پروانہ لگا کر کے بد امنی پیدا کر دیتا ہے اور پھر اپنی قوم کی شکایات دور کرنے کا بہانہ پیدا کر کے مداخلت شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے یورپ کا کوئی ملک اب اس خطرہ سے خالی نہیں ہے، سوئٹزرلینڈ، بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک، ایرلینڈ،

بلقان و بالٹک، ہر جگہ نازی تحریک کام کر رہی ہے اور جرمنی سے ہر طرح کی مدد انھیں پہنچنی ہے۔ اس کا مقصد سوائے اس کے کوئی نہیں کہ صرف یورپ بلکہ تمام دنیا کے جمہوریت کا خاتمہ کر دیا جائے اور آمریت و استبداد اس کی جگہ لیے لیکن جمہوری حکومت کی سب سے بڑی عامی حکومت برطانیہ کا کیا حال ہو گا صحیح اندازہ مسٹر ایملر ڈیوس کے اس مقالے ہوتا ہے جو نیو ریپبلک میں شائع ہوا ہے۔ مسٹر ڈیوس امریکن ہیں اور برطانیہ کے ساتھ خاص ہمدردی رکھتے ہیں۔ لیکن اس مسئلہ میں کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو امریکہ اس کا ساتھ دے گا یا نہیں، وہ زیادہ امید افزا خیالات نہیں رکھتے۔ وہ لکھتے ہیں ”یہ بالکل صحیح ہے کہ ہمارے اور برطانیہ کے درمیان ”جمہوریت“ کا خیال ایک غرض مشترک کی حیثیت رکھتا ہے اور باہمی ہمدردی و تعاون کے لئے یہ خیال کافی ہے، لیکن افسوس ہے کہ مسٹر چمبرلین نے جو آج جمہوریت کے نام پر امریکہ کی مدد کے متوقع ہیں اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ برطانیہ کے سامنے جمہوریت کے تحفظ کا کوئی سوال نہیں، بلکہ صرف ذاتی مفاد کا ہے، اور اس لئے اب گفتگو کی نوعیت یہ ہو جاتی ہے کہ امریکہ برطانیہ کے مفاد کے تحفظ کے لئے اس کی مدد کرے گا یا نہیں، اور اس کا جواب شاید زیادہ امید افزا نہیں دیا جاسکتا۔

مسٹر چمبرلین نے زکو سلوو ویکیا کے باب میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مقصد جمہوریت کا تحفظ نہیں اور اس لئے اب (جبکہ جرمنی کی دراز دستیاں برطانوی مقبوضات کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو رہی ہیں) چمبرلین کا جمہوری حکومتوں کو اتحاد کی دعوت دینا نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ اس طرف تو جمہوریت کے تزلزل کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف نازیت کے زور و مظنہ کو دیکھئے کہ زکو سلوو ویکیا پر وہ قابض ہو گئی، میل پر اس کا تصرف قائم ہو گیا، پولینڈ سے اس نے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، ہنگری اس کے زیر اثر ہو گیا، رومانیہ اس کی ریشہ دوانیاں کا میاں ہو گئیں، اور اسپین میں بھی وہی ہو کر رہا جو وہ چاہتی تھی۔ پھر ایسی صورت میں کھلا ہوا نتیجہ یہی ہے کہ اگر کسی وقت عالمگیر جنگ شروع ہو گئی (اور وہ وقت دور نہیں ہے) تو جمہوری حکومتوں کے پاس کوئی اخلاقی قوت موجود نہ ہو گی اور برطانوی آبادی نے اگر اطالی میں حصہ لیا بھی تو وہ کسی اصول کے تحت نہ ہو گا بلکہ صرف اس خوف کی بنا پر ہو گا کہ مبادا ہٹلر یا موسولینی کی حکومت وہاں قائم ہو جائے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت مسٹر چمبرلین نے دنیا کو جنگ کے خطرہ سے بچا لیا، لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ اس نے جنگ کے خطرہ کو اور زیادہ قوی کر دیا ہے اور جمہوریت کے تابوت میں انھوں نے اپنی پالیسی سے اتنی کیلیں ٹھونک دی ہیں کہ سوائے قبرستان لیجانے کے اب اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔

حیدر آباد اور آریہ سماجی تحریک

یونٹو آریہ سماجی تحریک حیدر آباد میں عرصہ سے قائم ہے اور آہستہ آہستہ مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑتی جا رہی ہے، لیکن کانگریس حکومتوں کے قیام کے ساتھ پچھلے ایک سال میں اس کی توقعات بہت بڑھ گئی ہیں اور اس نے وہ اقدامات شروع کر دیے ہیں جو اخلاقی، سیاسی اور مذہبی سر حیثیت سے ناقابل درگزر ہیں۔ گو بنظاہر مذہبی حیثیت سے کانگریس کو اس تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن قومی و اخلاقی حیثیت سے وہ اس کی تقویت کا باعث ضرور ہے اور اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ سی۔ پی کے اسپیکر ایسی حیثیت کے کانگریسی اس تحریک کی کھلی ہوئی اعانت کر رہے ہیں اور مسٹر ساورکر ایسے حضرات اس کو ہندو راج کے قیام کا ذریعہ قرار دیکر اس کی تبلیغ و اعانت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

اس تحریک کے سلسلہ میں سب سے بڑا نا جائز قایدہ اس خیال سے اٹھایا جا رہا ہے کہ وفاقی حکومت کی کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ریاستوں میں بھی ذمہ دارانہ حکومتیں قائم ہو جائیں اور اسکی تائید کبھی کبھی برطانوی ارباب حل و عقد کے بیان سے ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ دور جمہوریت کا ہے اور اب وہی ریاست نیک نام رہ سکتی ہے جہاں ذمہ دار حکومت پائی جائے، لیکن پہلے تو ہمیں یہی سمجھنا ہے کہ ذمہ دار حکومت سے کیا مراد ہے اور یہ کہ اس کے حاصل کرنے کا کیا ہی مناسب طریقہ ہے جو حیدر آباد کے آریہ سماجیوں نے اختیار کیا ہے، جبکہ فی الحقیقت آریہ سماجی جماعت آزادی نہیں بلکہ مذہبیت کی بنا پر شورش برپا کرنا چاہتی ہے۔

اصولی بات ہے کہ کسی ملک میں ترقی یا انقلاب کی خارجی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، یعنی جب تک خود اندرون ملک میں اس کا احساس پیدا نہ ہو کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا، پھر اگر ہم آریہ سماجی تحریک کو جمہوریت ہی کی تحریک قرار دیں تو کیا یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ خود حیدر آباد کی آریہ سماجی جماعت تو اس باب میں خاموش ہے اور آواز بلند ہوتی ہے، شولا پور، ناگپور، پونا اور دہلی سے!

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حیدر آباد کے ہندوؤں اور آریہ سماجیوں کو تو فی الحقیقت کوئی شکایت نہیں ہے لیکن برطانوی ہند کی متعصب جماعتیں یہ شورش صرف اس لئے برپا کرنا چاہتی ہیں کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست پر کیوں مسلمان خاندان حکمران ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حیدر آباد میں ہندوؤں کی آبادی ۸۵ فیصدی ہے لیکن محض کسی محکوم جماعت کی اکثریت اس کو مستلزم نہیں کہ حاکم جماعت ضرور بُری ہو۔

یہ کسی مسلمان کا کہنا نہیں بلکہ مسٹر رامارائو اور سوامی کلچوگ نندا ایسے ذمہ دار ہندوؤں کا بیان ہے کہ

حیدر آباد کی بیچ قوموں کو (جنکی تعداد ۶۰ فی صدی ہے) جو مذہبی و اقتصادی آزادی حیدر آباد میں حاصل ہو نہ برطانوی ہند میں نظر آتی ہے نہ کسی اور ریاست میں۔ اور کیا ان شہادتوں کے ہوتے ہوئے یہ امر حیرتناک نہیں کہ وہاں کی آریہ سماجی جماعت جس کی آبادی ۵۰ فی صدی نہیں ہے یہاں کی حکومت کو بدترین حکومت قرار دیتی ہے۔ گزشتہ دس بارہ سال کے اندر یہاں کی ۶۵ ہزار غیر آریہ سماجی آبادی کو آریہ سماجی بنالینا کیا اس کا ثبوت نہیں کہ وہاں کی سب سے کم آبادی کو کس قدر زیادہ مذہبی آزادی حاصل ہے۔

اس وقت حیدر آباد میں ۲۶۰۰۰ مندر اور ۵۰۰۰ مسجدیں ہیں اور سب کو برابر برابر اداریہ ریاست سے ملتی ہے، کیا اس کی مثال کسی ہندو ریاست یا خود برطانوی ہند میں پیش کی جاسکتی ہے۔ اس وقت وہاں دس ہزار ہندو خاندان ایسے ہیں جن میں پٹواری اور پٹیل نسلاً بعد نسل ہوتے چلے آ رہے ہیں اور مسلمان خاندان ایسے صرف ۴ ہزار ہیں۔ پھر اگر حکومت جابر و متعصب ہوتی تو کیا اس وراثتی روایت کو مٹا دینا دشوار تھا اور کیا آج اتنے ہندو خاندان پٹیل رہ سکتے تھے۔ سلاوہ اس کے حیدر آباد میں ہندو جاگیردار بہ کثرت پائے جاتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دکن کی حکومت میں آج کیا کبھی ہندوؤں کے ساتھ تعصب نہیں برتا گیا، جاگیر کا مسئلہ حیدر آباد میں بالکل شایانہ مرضی پر موقوف ہے اور اس میں کسی کو بھی دخل دینے کا حق حاصل نہیں ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آصفیہ خاندان کے حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ مراعات روا رکھیں اور موجودہ فرمانروا نے تو ہندوؤں کی متعدد ڈوبتی ہوئی جاگیروں کو ان کا قرضہ خود ریاست کی طرف سے ادا کر کے فنا ہونے سے بچالیا۔ آپ کو یہ منکر حیرت ہوگی کہ ریاست کی متعدد مسجدیں اور خانقاہیں ایسی ہیں جن کے متولی ہندو ہیں اور یہ حکومت دکن کی بے تعصبی اور وسیع النظری کا اتنا بڑا ثبوت ہے جس کی مثال کہیں اور مل ہی نہیں سکتی۔

ہندوؤں کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہاں کی ملازمت میں ہندوؤں کی تعداد بہت کم پائی جاتی ہے یہ صحیح ہے، لیکن اس کا سبب یہ نہیں کہ حکومت قصداً ایسا چاہتی ہے، بلکہ اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ دکن کے مسلمانوں کا داخلہ ہی اول اول ملازم ہونے کی حیثیت سے ہوا تھا اور اب تک ان تمام خاندانوں میں نوکری ہی کا رواج چلا آتا ہے۔ ہندو چونکہ زیادہ تر کاشت اور صنعت و حرفت پر بسر کرتے تھے، اس لئے انھوں نے خود ہی ملازمت کی طرف توجہ نہیں کی اور نہ ان کو اس کی ضرورت تھی۔ حکومت نے بھی ان کو نوکری سے باز نہیں رکھا، چنانچہ اس وقت وہاں کوئی محکمہ ایسا نہیں ہے جس کے امتحان مقابلہ میں شریک ہونے کی اجازت ہندو مسلمان دونوں کو یکساں طور پر حاصل نہ ہو۔

آریہ سماجیوں کو شکایت ہے کہ وہ مذہبی تبلیغ وہاں نہیں کر سکتے۔ اس کی تردید اس واقعہ سے ہو سکتی ہو کہ

سرزمین دکن جہاں اب سے چند سال قبل ایک آریہ بھی نہ پایا جاتا تھا آج وہاں تقریباً ستر ہزار آریہ پاسے جاتے ہیں۔

حکومت نے کبھی نہ کسی کو آریہ ہونے سے باز رکھا اور نہ اسلام لانے کی ترغیب دی۔ البتہ اس نے کسی مذہبی جماعت کو سیاسی ادارہ بننے کی اجازت نہیں دی اور یہی اصل شکایت آریہ سماجیوں کی ہے جسے وہ اپنی زبان سے نہیں نکال سکتے۔

جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں۔ خود ریاست کے اندر رہنے والے ہندوؤں کو کبھی حکومت کی طرف سے شکایت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ یہ صرف بیرونی عناصر ہیں جو وہاں ہندو مسلم سوال پیدا کر کے بد امنی پیدا کرنا چاہتے ہیں، سو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر حیدر آباد کے مسئلہ کو ہندوؤں نے آل انڈیا مسئلہ بنا کر پیش کیا، تو مسلمانان ہند بھی اس کا جواب اسی اجتماع و اتحاد کے ساتھ دیں گے جو کسی ملک کی نوکروں کو آبادی میں پایا جاتا ہے اگر آریہ سماجی ادارے ہندوستان میں ہندو راج کا خواب دیکھ رہے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی یقیناً ان پر حقیقت ثابت کئے بغیر نہ رہیں گے کہ

ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

بوس اور گاندھی | امسال کانگریس کی صدارت کے لئے گاندھی کی مرضی کے خلاف بوس کا دوبارہ منتخب ہو جانا بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ اول تو سوشلسٹ جماعت اب اتنی کمزور نہیں رہی جتنی پہلے پائی جاتی تھی، دوسرے بوس کے خلاف جن صاحب کا نام گاندھی جی کی طرف سے پیش کیا گیا، اس میں کوئی وزن نہ تھا۔ لیکن بوس کے ساتھ گاندھی جی اینڈ کو نے جس اخلاق کا مظاہرہ اس وقت تک کیا ہے وہ ضرور حیرتناک ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پنڈت پنٹ کے رزولوشن نے جو فی الحقیقت گاندھی جی اور ٹیل ہی کا ترتیب دیا ہوا تھا، مسٹر بوس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دئے ہیں اور خود سوشلسٹ جماعت کے افراد نے بعد کو جس ذہنیت کا ثبوت دیا ہے وہ بھی بوس کے لئے حد درجہ مایوس کن ہے، لیکن گاندھی جی کا دہلی سے الہ آباد جانا، بوس کا بستر علالت سے گاندھی جی کی ملاقات کی خواہش کا ظاہر کرنا اور اسپرینڈٹ جو اہر لال نہرو اور گاندھی جی کا نہایت خشک جواب دینا، ایسا غمزہ ناز و اتھا جس کی تاویل گاندھی جی کے حق میں کوئی نہیں کی جاسکتی۔

بہر حال اب صورت حال یہ ہے کہ بوس کی صدارت کانگریس کی گزشتہ پالیسی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی اور گاندھی جی کا اقتدار پھر بدستور قائم ہو گیا ہے۔ ورکنگ کمیٹی کا انتخاب ابھی تک نہیں ہوا ہے لیکن وہ بھی ہو جائے گا اور اس طرح ہوگا جس طرح گاندھی جی چاہیں گے۔

جنوری ۱۹۳۹ء کا ”نکار“

نظیر کے لئے وقت ہوگا اور چونکہ نظیر اکبر آباد کارہنے والا تھا اس لئے اس پرچہ کی ترتیب کی ذمہ داری بھی اکبر آبادی کے ادب پر عاید ہونی چاہئے اور ہم جناب لطیف اکبر آبادی کے ممنون ہیں کہ انہوں نے یہ خدمت اپنے سر لینا منظور کر لیا ہے۔

نظیر اکبر آبادی کو کون نہیں جانتا، لیکن اس کا علم کم حضرات کو ہے کہ جامعیت کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی شاعر میر سے لیکر غالب تک نظیر کا ہم پلہ نہیں۔ ممکن ہے آپ یہ شکر حیرت کریں، لیکن جس وقت آپ جنوری گزشتہ کا نکار پڑھیں گے تو آپ کو اس دعوے کی صداقت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

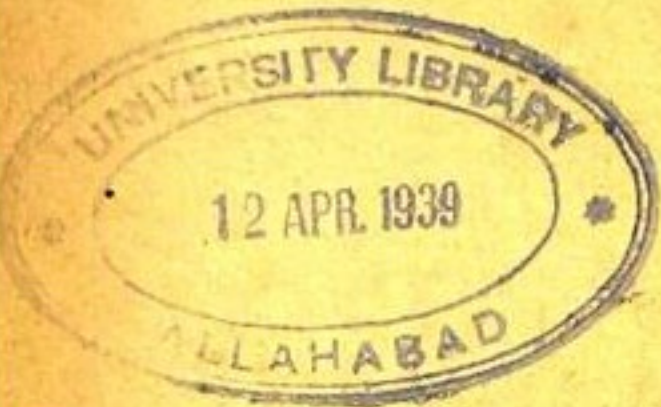
ذیل میں وہ چند عنوانات پیش کئے جاتے ہیں جن پر مقالے مطلوب ہیں :-

- (۱) نظیر کے حالات زندگی۔ (۲) نظیر کی شاعری پر عمومی تبصرہ۔ (۳) نظیر کی غزل گوئی۔ (۴) نظیر کا فلسفہ زندگی و نظریہ اخلاق۔ (۵) نظیر کے ادبی احسانات۔ (۶) نظیر کے زمانہ کی زبان اور نظیر کے اجتہادات لسانی۔ (۷) کلام نظیر میں وطنیت کا عنصر (۸) نظیر اور کبیر۔ (۹) نظیر اور میر۔ (۱۰) نظیر کا کلام اور اس عہد کی معاشرت۔ (۱۱) نظیر کی غیر مطبوعہ تصانیف۔ (۱۲) نظیر کی فارسی دانی (۱۳) تلامذہ نظیر۔ (۱۴) نظیر مذکورہ نویسیوں کی نظر میں۔ (۱۵) نظیر کی ہندوانہ نظمی میں ہندوستان کے تمام ارباب قلم اور خصوصیت کے ساتھ اپنے حلقہ احباب کو اس طرح متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ اس باب میں وہ میری اور جناب لطیف کی پوری اعانت فرمائیں گے۔ مقالات اکتوبر تک پہنچ جانا چاہئیں۔

”نیاز“

انتقادیات

(مسل)



اس سہ گانہ تقسیم کی بحث سے ارسطو کے مقالے کا موجودہ حصہ حزنہ ڈراما کی بحث کے لئے میدان طیار کرتا ہے۔ اور بحث کے اس نقطے تک پہنچ کر ارسطو (یا شاید الحاق کرنے والے) نے ایک باب کے اندر ادب کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اصل شاعری سے بحث کی ہے۔ یہ بحث ضعیف، غیر محتاط اور عجیب ہے اور کوئی عقلی نتیجہ اس سے نہیں نکل سکا ہے لیکن اس سے حرج یا نقصان اس لئے واقع نہیں ہوتا کہ ارسطو کی بحث اور اس کا نظریہ تو صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ شاعری واقعتاً جو کچھ بھی ہو اس کی نوعیت کیا ہے؟ اسے سوال سے کوئی واسطہ نہیں کہ شاعری وجود میں کیونکر آئی؟ لیکن بہر حال غلط فہمی پیدا ہو جانے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ ارسطو کے مقالے میں ایک خاص باب کے اندر لفظ ”نقل“ ”مونہ چڑھانے“ کے معنی میں استعمال ہو گیا ہے (جس کا الحاقی ہونا بعید از قیاس نہیں)۔ لیکن اگر اس کی بناء پر استدلال کیا بھی جائے تو اس سے کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر اس مشکوک مفہوم ”نقل“ کو لفظ بحث بنایا جائے اور اس کی صحت مان لی جائے تو اس مقالے کی باقی تمام بحث ناقابل فہم ہو جائے گی۔

اس نفس واقعہ سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ پورے مقالے میں لفظ ”نقل“ کا جو مفہوم ہے وہ اس مفہوم سے مختلف ہے جو اس خاص باب کے اندر استعمال ہوا ہے۔ ان وجوہ کے ہوتے ہوئے ارسطو کے نظریے کو سمجھنے کی خاطر ہمیں اس خاص باب کو بالکل نظر انداز کر دینا پڑے گا۔

فلسفہ جمالیات کا موسس اول ارسطو ہے اور یہ واقعی عجیب بات ہے کہ جمالیات کی یہ ابتداء ایسی معین اور تنہ صحیح طریق پر ہوئی کہ ارسطو کا یہ مقالہ اولین اس موضوع پر آج تک آخرین لفظ بنا ہوا ہے

ایک عام تجربے کی بات ہے کہ جب کوئی جدید علم مرتب ہوتا ہے تو مروجہ زبان ہی سے اس علم کی اصطلاحات اختیار کر لی جاتی ہیں اور ایسے الفاظ کا مفہوم اس وقت غیر معین ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا بڑا امکان ہے کہ لفظ ”نقل“ کا جو مفہوم ہم لے رہے ہیں، ارسطو نے اس کی یہ تعریف دانستہ نہ کی ہو۔ یعنی مفہوم کا یہ پہلو اس کے سامنے نہ رہا ہو

ارسطو کے سامنے ایک عندیہ یا خیال موجود تھا اور ایک لفظ بھی تھا کہ اپنی بحث میں وہ اُسے استعمال کر سکے چنانچہ جس طرح اُسے مناسب نظر آیا اُس نے اُس کا استعمال کیا۔ لیکن چونکہ نوعیت شاعری کے متعلق ارسطو کا ادراک بہت نازک تھا اس لئے اُس کے ادراک نے اُس بحث کے اندر لفظ ”نقل“ کا موزوں و صحیح ترین استعمال کر دیا، اور شعرو شاعری سے متعلق اس لفظ کا یہی ایک استعمال قابل فہم ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ اس لفظ کے اس استعمال ہی سے ارسطو تکنیک اور لہام کے درمیان امتیاز قائم کر سکا ہے اس لئے یہ استعمال نظریۂ ادب میں ناقابل قدر اضافے کا سبب ہوا۔

اتنی گفتگو کے بعد اب ارسطو کے اصل موضوع یعنی ”حزنیہ“ کو سمجھنا مناسب ہوگا۔ رزمیہ اور ڈرامائی کے اختلاف کو مختصراً بیان کرتے ہوئے ارسطو ایک نکتہ کہہ گیا ہے جو غیر معمولی طور پر مقبول ہوا، حالانکہ وہ نکتہ اتنا اہم نہ تھا رزمیہ اور ڈراما میں کھلا ہوا فرق یہ ہے کہ ڈراما کے مقابلے میں رزمیہ نظم بہت زیادہ طویل ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ڈراما ایک تماشے (Performance) میں مکمل طور پر پیش ہو جانا چاہئے، لیکن ایک رزمیہ میں اس شرط کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ اس لئے فطری طور پر دونوں کے مضامین مختلف ہونے چاہئیں اور چونکہ ارسطو کے سامنے یونانی ڈراما تھا اس لئے اُس کی نظر میں یہ اختلاف بہت قابل توجہ تھا۔ ارسطو نے کہا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، ڈراما اپنی تمثیل کو چوبیس گھنٹے کے اندر ختم کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف رزمیہ کے عمل کے واسطے کوئی پابندی نہیں ظاہر ہے کہ ارسطو کا یہ حوالہ صرف یونانی حزنیہ کے رواج سے متعلق تھا نہ کہ ڈرامائی تخلیقی نوعیت سے۔

یونانی حزنیہ میں سلسلہ تمثیل منقطع نہ ہوتا تھا اس لئے اس کے لئے وہی فسانہ مناسب ہوتا تھا جسکے واقعات میں تفاوت زمانی نمایاں نہ ہو اور بعد مکانی بھی نہ ہو۔ لیکن چونکہ حزنیہ کا قص و غنا (Closure) اس تسلسل کو قطع کر دیتا تھا، اس لئے مصنف کو وقفہ زمانی اور تبدل مکانی کا موقع مل جاتا تھا۔

یونان کے حزنیہ نگار شعرا نے گاہ گاہ ایسی صورت حال سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ قول کہ حزنیہ میں چوبیس گھنٹے کے اندر واقعات کو محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ معنوی اعتبار سے زیادہ اہم نہیں، تاہم تاریخ انتقادی میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی، ڈراما کی سہ گانہ وحدت یعنی وحدت عمل، وحدت زمان اور وحدت مکان سے اب ہر شخص واقف ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر ارسطو نے ذکر نہ کیا ہوتا تو یہ قاعدہ کبھی وجود میں نہ آتا۔ مگر ارسطو کے مفہوم کو غلط سمجھے جانے سے جو نتائج رونما ہوئے ان کا ذمہ دار ارسطو نہیں ہو سکتا۔ یورپ کے عہد نہضت کے بعد سے، اور بالخصوص فرانس و اطالیہ میں نقادوں نے اس سہ گانہ وحدت کو ارسطو اور یونانی حزنیہ نگاروں کی سند پر ڈراما نویسی کے لئے بطور اصل اصول ماننا شروع کر دیا۔ وحدت عمل کی یونانی حزنیہ میں اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ نیز خود ارسطو کا قول اس کی بہترین سند ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے ارسطو ہی نے صاف و واضح طور پر اسے ضروری قرار

یا ہے۔ رنگینی وحدت زمان اور وحدت مکان سو یونانی حزنہ میں کوئی مثال ان کی ضرورت کو ثابت کرنے والی نہیں
 تھی اور ارسطو کے قول کو اگر صحیح طور پر سمجھا جائے تو اُس سے بھی کوئی سند فراہم نہیں ہوتی۔ البتہ وحدت مکانی کے
 مسئلہ میں ایک جگہ ارسطو کے بیان سے استناد کیا جاسکتا ہو، مگر وہ بھی کھینچ تان کے بعد ارسطو نے اس باب میں جو رائے
 ظاہر کی ہے وہ اصولی نہیں ہے بلکہ ”حزنہ جو کچھ ہے“ اُس پر ایک سرسری بیان حوالہ قلم کر دیا گیا ہے اس لئے پہلے
 ہم ارسطو کی وہ تعریف بیان کرتے ہیں اور پھر اُس کی تشریح کا خلاصہ پیش کریں گے۔
 حزنہ کی تعریف ارسطو ذیل کے الفاظ میں کرتا ہے:-

”کسی سنجیدہ فعل یا عمل کی نقل کا نام حزنہ ہے، جو اپنی جگہ مکمل ہو اور اُس میں کوئی مخصوص عظمت پائی جائے
 اُس میں زبان وہ اختیار کی جائے جو تصنیف کے ہر جزو کے اعتبار سے انبساط آفریں ہو اور جو بیان کی شکل
 میں نہیں بلکہ ڈراما کی صورت میں ہو اور جو خوف و ہمدیدی کے ذریعہ سے ان جذبات کی تزیین (Katharsis) کرتی ہو۔“

یہ لفظی ترجمہ نہیں بلکہ خلاصہ ہے، اس تعریف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلی تقسیم اُس سے گانہ تقسیم
 سے مماثل ہے جس سے ”شعریات“ کا آغاز ہوتا ہے تقسیم گویا مدعا ”واسطہ“ اور ”طریقہ“ سے تعلق رکھتی ہے۔
 دوسری تقسیم حزنہ کا مقصود بتاتی ہے۔ لیکن حزنہ کی اس پوری تعریف میں اصل لفظ ”کٹارسس“ ہے۔ یہ ہم پہلے
 بتائے ہیں کہ ارسطو کے نزدیک حزنہ کی صحیح فہم کے لئے اُس کے مقصود کو سمجھنا بھی اتنا ہی لازم ہے جتنا کہ اُسکی
 نوعیت کو اب یہاں وہ بتاتا ہے کہ حزنہ کا مقصود ”کٹارسس“ ہے۔ لیکن یہ ”کٹارسس“ کیا ہے؟ اس بات
 کو ارسطو نے کہیں صاف نہیں کیا۔ اس لفظ کا مفہوم مبہم ہے، اور عام طور پر ”صاف کرنا“ یا ”پاک کرنا“ کے معنی میں
 آتا ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ ارسطو نے کس مفہوم میں استعمال کیا ہے اور وہ اُس پر کتنا زور دینا چاہتا ہے؟ کیونکہ یہ
 غلط بہر حال استعارہ (Metaphorical) ہے۔ لیکن سر درست اس لفظ کے صحیح مفہوم کے مسئلہ کو ملتوی
 کر کے اُس کے مفہوم کے متعلق بعض ضروری تحقیقات قائم کر لینا چاہئے۔

سب سے پہلے تو نوعیت حزنہ کے متعلق ارسطو کے عندیہ کا سمجھنا ضروری ہے۔ اُس کے بعد یہ جاننے کی
 کوشش ہونا چاہئے کہ ”کٹارسس“ کی اصطلاح سے ارسطو نے کیا مراد لیا ہے۔ لیکن ہم اگر یہ دیکھیں کہ
 اس لفظ سے ارسطو نے جو مفہوم مراد لیا ہے وہ قابل اطمینان نہیں، تو پھر جاری سعی یہ ہونا چاہئے، کہ ہم ارسطو کے ”نوعیت حزنہ“
 کے عندیہ سے ایک عندیہ پیدا کریں جو اُس کے عندیے سے مماثل ہو۔ اگر ایسا ہو اور ارسطو کے ”نوعیت حزنہ“ کے عندیے
 سے حقیقی طور پر ایک مقصود قرار پاسکے تو اُس سے حزنہ کا جو تخیل قائم ہوگا اُسے بجا طور پر ارسطو کا ”نظریہ حزنہ“ کہا
 جاسکیگا اور اُس ”نظریہ حزنہ“ کی صورت مثالی (Typical) ”نظریہ ادب“ کی حیثیت سے ہوگی۔

اس لئے پہلے ہم کو ارسطو کی مذکورہ بالا تعریف حزنہ کی صراحت کر دینا چاہئے کہ ان شرائط سے ارسطو کی مراد کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ”حزنہ ایک فعل یا عمل کی نقل ہے“ یہاں فعل یا عمل سے مراد کوئی واقعہ (Event) یا واقعات کی ترتیب ہے۔ یعنی جو کچھ وقوع پذیر ہوا ہے۔ لیکن اس کو فعل یا عمل سے تعبیر کرنے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واقعہ کسی ذریعہ سے ظاہر ہوا اور یہ ذریعہ بلاشبہ انسان ہی ہو سکتا ہے جس کا یہ فعل اس کا کردار کہا جائے گا۔ لہذا وہ فعل جس کی ”نقل“ ”حزنہ“ ہے، واقعات کا ایک عمل ہے جو انسانی زندگی اور اردوں میں مشکل ہو گیا ہے۔ لیکن حزنہ ایک ایسے فعل کی ”نقل“ ہے جو اپنی جگہ مکمل ہے اور جس میں عظمت بھی ہے۔ ”اپنی جگہ مکمل“ ہونے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ وہ فعل بجائے خود ایک ”کل“ کی صورت لئے ہوئے ہے اور ”کچھ عظمت رکھنے“ کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک ”کل“ کی حیثیت سے تسلیم ہو سکتا ہے اور نہ اتنا مختصر ہے کہ قابل لحاظ نہ ہو اور نہ اتنا طویل کہ قابل عمل نہ ہو سکے۔ لیکن ایک ”کل“ یعنی مکمل ہونے کے لئے اس فعل یا عمل کا آغاز، اُس کا وسط اور اُس کا انجام ہونا بھی از بس ضروری ہے، اُس کے اندر ایک مخصوص لفظ (Definite Point) ایسا بھی ہونا چاہئے جس سے واقعات کا آغاز ہو اور دوسرا لفظ وہ جہاں اس کا اختتام ہو۔

”حزنہ نقل“ (Tragic Imitation) کا مقصد یہ ہے جو ابھی بیان ہوا اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ”حزنہ نقل“، ”نقل فطرت“ نہیں ہے، کیونکہ فطری واقعات کا وقوع اس طرح نہیں ہوا کرتا۔ فطرت کے اندر کوئی شے نہ کسی معین نقطے سے شروع ہوتی ہے اور نہ کسی مقرر نقطہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ فطرت میں تو ایک کامل سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چنانچہ حزنہ جس چیز کی نقل کرتی ہے وہ زندگی نہیں بلکہ زندگی کا ایک تصور ہے اور بالکل مختلف شے شاعر کا نفس زندگی کے متعدد مکانی تعلقات کو لے کر پیش کرتا ہے اور اس کا احساس ایک ایسا حتمی عندیہ بن جاتا ہے۔ جسے ہم نے اوپر کہیں ”الہام“ سے تعبیر کیا ہے۔ بہر حال جو ”نقل“ اس طرح پیش کی جائے گی وہی سچی حزنہ ہوگی۔

شاعر کے خیال میں آنے والی پہلی چیز فعل یا عمل (Action) ہے نہ کہ پلاٹ یعنی ترتیب واقعات میں پہلے تجزیاتی عمل کا اظہار ہوتا ہے، پھر پلاٹ کا اور اس کی صداقت کو جانچنا آسان کام ہے اسکے لئے ہمیں بس اتنا کرنا ہے کہ ایک حزنہ کو اسٹیج پر دکھیں اُس کے نظارے سے ہمارے اندر جو کیفیت پیدا ہو اُس کو الٹا کر کے دکھیں گے تو وہ ارسطو کی اسکیم کی ترتیب سے بالکل مطابق ہوگا۔ ارسطو کی اسکیم صناعت کا نظریہ محض ہے۔ لیکن اُس صناعت کو سمجھنے کیلئے تھیٹر میں ہم سب سے پہلے الفاظ سنتے ہیں، پھر بولنے والے کے حسیات و خیالات سے آشنا ہوتے ہیں اور اس سے کردار کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اس بحث میں زبان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ زبان ہی وہ چیز ہے جو ڈراما نویس کے ٹیکنیک کے پورے سلسلہ کی حامل ہوتی ہے اس بنا پر ڈرامائی زبان حقیقی زندگی کی زبان نہیں ہو سکتی، کیونکہ حقیقی زندگی کی زبان پر وہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جو ڈرامائی زبان پر عاید ہے۔ ڈراما کے مکالمے کو غیر معمولی طور پر اظہاری

بلکہ ایک حد تک غیر فطری ہونا چاہئے۔

ارسطو اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ ”پلاٹ پہلا اصول اور صحیح طور پر حزنِیہ کی جان ہے، کردار کا نمبر دوسرا ہے۔“ یہ نظریہ اکثر ناقدوں کے اس مفروضے سے یکسر مختلف ہے کہ کردار ڈراما کا پہلا اصول ہے۔ ارسطو کی دلیل یہ ہے کہ کردار کو کتنا ہی بہتر بنا کر پیش کیا جائے وہ اپنی ذات سے حزنِیہ کبھی پیش نہیں کر سکتا اور کردار نگاری (Characterization) اصل میں جتنی تکنیک کا جزو ہے اتنی ہی اُس کی زبان کی عروضیت (Prosody) یا تشبیہات (Imagery) کی جزو ہے۔ یہ مان لینا کہ ڈراما نویس کا پہلا فرض کردار کو پیش کر دینا ہے، درست نہیں۔ کیونکہ ڈراما نقل بیشک کرتا ہے، مگر وہ زندگی کے تصور کی نقل ہوتی ہے اور کردار نگاری اس ”نقل“ کا ایک پہلو ہے۔ حزنِیہ کی تعریف ہنوز نامکمل ہے، اور اُس میں ابھی ایک شرط کے اضافے کی اور ضرورت ہے یعنی حزنِیہ جس فعل کی نقل کرتی یا اظہار کرتی ہے، اُسے سنجیدہ بھی ہونا چاہئے۔ یعنی حزنِیہ کے لئے خوف و ہمدردی کے جذبات کو براہِ نگاہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس موقع پر ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ ارسطو کی بحث کی تہ میں فلاطون کے اعتراض کا رد بھی ہے۔ کیونکہ فلاطون کا سنگین ترین اعتراض خوف و ہمدردی کے جذبات اُکسانے کے مقصد پر تھا فلاطون کے اعتراض میں جتنا استحکام ہے وہ شاعری کی ”نقل“ کو غلط طور پر سمجھنے کی بناء پر ہے، اور جب شاعرانہ نقل کی حقیقی نوعیت بیان ہو جاتی ہے تو اعتراض دفع ہو جاتا ہے۔ فلاطون کا اعتراض شاعری اور خاص کر حزنِیہ پر یہ تھا کہ چونکہ اُس میں جذبات کو اُکسانے کی طاقت ہے اس لئے وہ باعتبار اثر بُری شے ہے۔ ارسطو نے اس سنگین الزام کا جواب اپنے اصول ”تنزیہ“ (کٹارسس) سے دیا ہے۔ ہر چند لفظ ”تنزیہ“ (کٹارسس) کی صراحت ارسطو نے کہیں نہیں کی ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اُس عہد میں یہ لفظ اتنا عام تھا کہ ارسطو کو اُس کا مفہوم واضح کر دینے کا خیال بھی نہ آیا۔ تاہم لفظ ”نقل“ کا مفہوم متعین کرنے سے زیادہ ضروری ہے کہ لفظ ”تنزیہ“ (کٹارسس) کا صحیح و قطعی مفہوم معلوم کیا جائے۔

لیکن ایک بار ہمیں یہ پھر سمجھ لینا چاہئے کہ حزنِیہ پر فلاطون کو کیا اعتراض تھا؟ اُس کا اعتراض یہ تھا کہ ایک حزنِیہ کا ہیرو ہمارے جذبات اپنی بد نصیبیوں کا رونا رو کر براہِ نگاہ کرتا ہے اور اپنی مصیبتوں کا جتنا گہرا احساس کر سکتا ہے، ہم اُس کی اتنی ہی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن واقعی زندگی میں، اس کے برعکس، ہم اُس آدمی کی داد دیتے ہیں جو اپنی تکلیفوں کو ظاہر نہیں ہونے دیتا اور برداشت کرتا رہتا ہے۔ پھر جس فعل کو ہم حقیقی زندگی میں ناروا سمجھیں، ایک ایک طرف اُسی فعل کے لئے داد و تحسین سے نوازیں کہاں کا انصاف ہے؟ اس کے علاوہ ہم جب اُس سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اُس کے المناک جذبات سے ہمیں لطف حاصل ہوتا ہے اور غم ایک معمولی چیز بن جاتا ہے۔ ارسطو کو تسلیم ہے کہ حزنِیہ کا کام جذبات کو ابھارنا ہے جو اپنی جگہ پر خطر بھی ہیں اور شاید ناخوشگوار بھی۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ حزنِیہ جس طریق سے جذبات کو برا نگینہ کرتی ہے وہ ان جذبات کی تنزیہ (کنار سس) کر دیتا ہے۔

لفظ ”تنزیہ“ (کنار سس) بہر حال ایک استعارہ ہے۔ یونانی زبان میں ”کنار سس“ کا مفہوم مذہبی رسوم سے بھی متعلق ہے (اور اس معنی میں اُس سے ”پاک کرنا“ مراد ہوگا) اور اُس کے اندر طبی نظریات کا مفہوم بھی ہے (اس معنی میں اُس سے ”صاف کرنا“ مراد ہوگا) مگر یہ سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ خوف و ہمدردی کو ”پاک صاف کرنے“ سے کیا مراد ہو سکتی ہے۔ مگر غالباً ملٹن پہلا شخص ہے جس نے ارسطو کے مفہوم کی صحیح شرح کی ہے۔ لکھتا ہے:-

”ارسطو نے (حزنِیہ کو) خوف و ہمدردی کے جذبات اُبھار کر ایسی طاقت بن جانے سے تعبیر کیا ہے جو نفس انسانی کو اُن جذبات یا اُن کی افراط سے صاف کر دیتی ہے۔ یعنی اُن جذبات کو جو حزنِیہ کو پڑھنے یا عمدہ طور سے نقل کئے جانے کو دیکھ کر برا نگینہ ہو جاتے ہیں ایک مناسب اعتدال پر لے آتی ہے۔“

جہاں تک مقصود حزنِیہ کا تعلق ہے، ”شعریات“ کا باقی کل حصہ ارسطو کی اسی تنزیہ کے تحت ہے۔ ارسطو کی شخصیت اور اُس کی عظمت نے عہدِ مابعد کے نقادوں کو بھی اس طرف مایل کر دیا کہ حزنِیہ ڈراما نویس کا پرکار ارسطو کے حزنِیہ کردار کے نظریے کے مطابق ہونا چاہئے چنانچہ (Prometheus Bound) کی حزنِیہ میں ایس کیلیس (Aeschylus) نے ایک ایسا ہیرو پیش کیا ہے جس کے اندر نقص و عیب بھی ہیں۔ لیکن یہ حزنِیہ جس خاص سبب کی بناء پر اعلیٰ ترین حزنِیہ قرار پائی اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہیرو اپنے نقص اور عیب کی پاداش نہیں بلکہ اپنی خوبی و نیکی کی سزا پاتا ہے۔

ل۔ احمد اکبر آبادی

توقیت کی خریداری

تاریخ اسلامی ہند کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہے۔ جو چھپکر روانہ ہونا شروع ہو گئی ہے۔ اگر اسوقت تک آپ نے نہیں خریدی تو اب توجہ کیجئے۔ قیمت مع محصول ۱۲/۰۰ ہے۔ منیجر نگار

انٹھی

(مسلسل)

(۳۳)

(شری پلنگ پر چادر لپیٹ کر پڑ جاتی ہے۔ "آج سے
میں بھی ایک تنکا اٹھا کر دوں گی" شری بڑبڑاتی ہوئی
پلنگ پر لیٹ جاتی ہے!)

"باہر سرن دروازہ کو کھٹکاتا ہے!"

سرن :- (باہر ہی سے) شری شری !!

(شری کے کانوں میں آواز ضرور آتی ہے۔ مگر صرف چادر
سے منہ نکالنے کے علاوہ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھتی بھی

نہیں ہے! وہ اپنے کان دروازہ کی طرف لگا لیتی ہے)

شری :- دروازہ تو کھولو۔ شری شری !!

کل تو تم نے یہاں سے چلے جانے کا ارادہ کر ہی لیا
ہے۔ کل صبح تو تم جاسے بغیر مانو گی نہیں۔

شری — شری !!

آج آخری دفعہ تو کوڑا نہ بند کرو۔ آج ایک بار
تو اور کوڑا کھول دو۔

شری !

آخری مرتبہ تو تم میرے دل کو نہ توڑو۔

اگر جانا تو لڑ کر کیوں جا رہی ہو۔ منہ سی خوشی جاؤ۔
شری !
کھولو کوڑا۔

کب تک ایسے کھڑا رہوں۔ کوڑا کھلنے کا انتظار کرتا
رہوں۔

شری ! شری !!

شری !!!

شری مجھے تم سے ابھی بہت کچھ کہنا ہے !

شری :- بہت کچھ سن چکی ہوں !

سرن :- اچھا تو کچھ نہ سننا۔ میں تم سے کچھ کہوں گا بھی نہیں

کوڑا تو کھولو! اندر مجھے آجانے دو۔ رات بھر

تو آرام سے سو لینے دو۔ پھر تو ساری زندگی راتیں

تارے ہی گن کر کٹے گی! پھر تو زندگی بے چینی و

بیقراری ہی میں گزرے گی۔ آج تو آخری رات

آرام سے سو لینے دو!

شری :- جب میں یہاں سے چلی جاؤں تو گھر میں جگہ ہی جگہ

ہو جاؤ گی۔ خوب آرام سے سونا۔

سرن :- ہاں شری۔ جب تم یہاں سے چلی جاؤ گی تو خوب آرام سے سوؤں گا!

کننتی :- کیا خیر کرے!

سیوا :- ہماری اور تمہاری زندگی۔

کننتی :- اونھ

(۴)

(کننتی اور سیوا کی جھونپڑی۔ جھونپڑی میں اندھیرا ہو گیا)

کننتی دیوا ہاتھ میں لے جھونپڑی میں گھستی ہے کہ اسکی ٹھوکر

اس کے خاوند سیوا سے لگ جاتی ہے)

کننتی :- بیچ میں پڑ گئے ہو۔ دروازہ ہی پر ایسے نہ سوچا کہ

باہر سے میں آؤں گی، دروازہ پر کیسے پڑ جاؤں۔

سیوا :- ہاتھ میں دیوا ہے۔ اتنی بڑی بڑی پرمانے آنکھیں

دی ہیں۔ تب بھی تمہیں سو جھانی نہیں دیتا۔

آج تم نے بڑا پاپ کیا۔

کننتی :- پاپ؟

سیوا :- ہاں!

کننتی :- کیسے؟

سیوا :- تم اندھی ہوتیں تو تمہیں ایشور بھی معاف کر دیتا

اب جب کہ تمہارے دو بڑی بڑی ہنڈاسی آنکھیں

ہیں۔ تب تو نہ وہ معاف کر سکتا ہے اور نہ میں!!

کننتی :- کیا ہوا تو!

سیوا :- تم نے اپنے پتی کے ٹھوکر ماری!

کننتی :- بڑا پاپ کیا؟

سیوا :- تم اپنے پاپ کو مذاق میں اڑا رہی ہو! پاپ کے

اوپر پاپ۔ گناہ کے اوپر گناہ!!

تم اپنے گناہ کو مانو۔ ورنہ۔ ورنہ۔

کننتی :- ورنہ کیا۔

سیوا :- برباد ہو جاؤ گی!

کننتی :- تم اپنی سنجیدگی کو اپنے پاس ہی رکھا کرو۔

سیوا :- میں دیکھ رہا ہوں کہ تم علیحدہ ہوتے جا رہے ہیں۔

کننتی :- ہو ہی رہے ہیں! کل میں صبح شری بی بی جی کے ساتھ

جاؤں گی۔

سیوا :- کہاں؟

کننتی :- ان کے گھر۔

سیوا :- گھر کیوں جا رہی ہیں!

کننتی :- سرن بابو سے ناراض ہو کر!

سیوا :- اوہ۔ زمانہ کیسا خراب ہے۔ آج کل سب عورتیں

ایسی ہی ہو گئی ہیں۔ تم میں بھی کچھ ایسی ہی عادت

آگئی ہے۔ تو تم کیوں ان کے ساتھ جا رہی ہو!

کننتی :- ان کو پہونچانے؟

سیوا :- یعنی تمہیں ان دونوں کی زندگی برباد کرنے والی

بنو گی تمہیں ان دونوں کو علیحدہ کرنے جا رہی ہو!

کننتی :- میں نے تو ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی

مگر انھوں نے اپنا ارادہ بدلا ہی نہیں۔ وہ تو اپنی

بات پر جمی ہیں!

سیوا :- جا کیوں رہی ہیں؟

کننتی :- اس لئے کہ ان کے ماں باپ ان کے نام اپنی

زمینداری کر دیں گے!

سیوا:- ناراضگی کا زمینداری سے کیا تعلق! اور زمینداری کا جانے سے کیا تعلق! عجیب معمہ ہے۔ میں تو بالکل نہ سمجھ سکا۔

کنتی:- ناراض وہ اس لئے ہیں کہ یہاں غریبی میں زندگی کاٹنی پڑتی ہے۔ وہاں ان کے واسطے سب کچھ ہونے کی امید ہے۔ وہ اکیلی رہ سکتی ہیں!

سیوا:- اکیلی!!

کنتی انھیں کے منہ بکے پہ لفظ ہیں!

سیوا:- یعنی سرک باؤ سے بالکل الگ!

کنتی:- اور کیا

سیوا:- اور تو ان کو بالکل الگ کرنے جا رہی ہے۔

کنتی:- اب تو وہ غصہ و غور میں اندھی ہو رہی! جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو ان کو واپس لانے کی کوشش کروں گی۔

سیوا:- تو جب تک وہ وہاں رہیں گی تب تک تم بھی مجھے اپنی شکل نہ دکھاؤ گی۔ اگر تم اس وقت ان کے ساتھ نہ جاؤ تو وہ کس کے ساتھ جاویں گی۔

کنتی:- تم اس وقت ان کی حالت دیکھو جا کر ان کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر میں انکے ساتھ نہ جاؤں تب بھی وہ جائے بغیر نہ مانیں گی!

سیوا:- اگر تم ان کو واپس نہ لائیں۔

کنتی:- ضرور لاؤں گی!

سیوا:- مجھے ڈر ہے کہ تم بھی کہیں اکیلی ہی رہنے کا ارادہ نہ کر لو! سب چاہتے ہیں کہ ہمارا جیسا ہر ایک ہو جاوے اور ویسے بھی یہ تو چھوٹ

کی بیماری ہے!

کنتی:- تو کیا مجھے بھی وہی بیماری لگ جائے گی۔

سیوا:- مجھے ڈر ہے! تم نے آج اپنے پتی کے ٹھوکر مار ہی دی۔

(۵)

(شری چادر اوڑھے پڑی ہے۔ گھنٹے کی آواز آتی ہے۔

بارہ بج گئے۔ شری نے کروٹ بدلی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی

تھیں، وہ پھر آنکھ بند کر کے لیٹ جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ

کہتی ہے۔ "کاش میں اس گھر میں نہ آتی!"

"ادھہ" کہہ کر وہ پھر کروٹ بدل لیتی ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے

بعد اس کے لبوں سے آواز آتی ہے۔ "جب میرے پاس

سب کچھ ہے۔" مجھے کسی کی دولت کی ضرورت نہیں!۔

نگران کا پریم! وہ ایک دم پلنگ پر اٹھ کھڑی جاتی ہے۔ حیانی سے

چاروں طرف دیکھتی ہے پھر لیٹ جاتی ہے۔

دو کا گھنٹہ سنائی دیا۔ وہ ایک دم پلنگ سے اُچھل پڑی

وہ چاروں طرف خوف زدہ آنکھوں سے دیکھنے لگتی ہے۔

"کیسی آواز۔" وہ پلنگ پر سے اُٹھ جاتی ہے اور فرش پر

ٹپٹنے لگتی ہے۔ کمرہ کی ایک کھڑکی کھول کر دیکھتی ہے۔ ابھی

تو اندھیرا ہے صبح نہیں ہوئی۔ پھر وہ کمرہ کی کھڑکی بند کر دیتی

ہے۔ ایک گڑھی پر بیٹھ جاتی ہے! ہر ہوا سائیں سائیں کر رہی

ہے! اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں! وہ پھر پلنگ پر

لیٹ جاتی ہے۔ منید کا جھونکا اس کے آتا ہے۔ آنکھ منہ پتی ہے

کہ اسے خیال آتا ہے میں برے راستے پر جا رہی ہوں۔ دفعہ

اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

وہ ایک دم پلنگ سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر یہ سمجھ کر کہ اس کا خیال ہی خیال تھا وہ کمرہ میں چاروں طرف گھومنے لگتی ہے۔ دروازہ کے کواڑوں کو چھوتی ہے۔ اس کی کندھی دیکھتی ہے اور بیٹھ جاتی ہے وہ بار بار اپنے سر کو ہلاتی ہے۔ جیسے کسی کے سر کے چاروں طرف کھسکیاں بھینھنا تھی ہوں اور وہ انکو اپنے سے دور رکھنے کے لئے سر ہلاتا تھا۔ وہ دروازہ کی طرف بھاگتی ہے۔ کواڑوں کو دونوں ہاتھوں سے پٹینے لگتی ہے۔ ایک دم وہ چونک پڑتی ہے۔ ہوش میں آتی ہے۔ گھڑی چار کا گھنٹہ بجاتی ہے۔ شری کمرہ کی کھڑکی کو کھول کر دیکھتی ہے۔ مشرق کی طرف ذرا ذرا سفیدی معلوم ہوتی ہے۔ وہ برابر کھڑکی کے باہر ہی دیکھتی رہتی ہے!

دوسرا ایکٹ

پہلا سین

(صبح کا وقت۔ ابھی پوری طور پر آفتاب طلوع بھی نہیں ہوا ہے۔ شری اپنے کمرہ میں جانے کا سامان ٹھیک کر رہی ہے۔ کنتی آتی ہے)

کنتی :- ارے بی بی جی آپ جاگ رہی ہیں!
شری :- آج میں سوئی ہی کب ہوں۔ تو سیوا سے پوچھ آئی۔
کنتی :- کیا؟
شری :- میرے ساتھ جانے کو۔
کنتی :- تو کیا ابھی تک تم نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔
شری :- نہیں۔

کنتی :- اب بھی بی بی جی وقت ہے!
شری :- کیسا وقت؟

کنتی :- سوچنے کا۔ سمجھنے کا۔ آگاہی یاد رکھنے کا۔
شری :- بہت کچھ سوچ لیا۔ رات بھر تو اسی سوچ و چار میں گزار دی۔ رات بھر انہیں خیالوں نے چین نہ لینے دیا۔ لیکن اب یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے!
کنتی :- مگر اس کا انجام تو سوچ لو۔
شری :- اب کچھ نہیں سوچتی شری مجھ میں اب سوچنے کی طاقت بالکل نہیں رہی۔ آج رات کی حالت تو میری دیکھتی دروازہ پٹینے کے علاوہ مجھ سے اور کچھ نہ بنایا کر اس وقت دروازہ کھل جاتا تو نہ معلوم اب تک کہاں پہنچ گئی ہوتی۔ اب میں یہاں زیادہ نہ ٹھہروں گی۔ اب میں یہاں نہ رہوں گی۔ تو جا جلدی سے تیار ہو جا۔

کنتی :- سرن! یہ کہاں ہیں!

شری :- اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرہ میں سو رہے ہوں گے!

کنتی :- تم ان سے مل آئیں!

شری :- ان کے پاس اب نہ جاؤں گی! میں کیسے جاؤں! پاؤں نہیں پڑتے (آواز بھرانے لگتی ہے) منہ نہیں پڑتا! اور اب میں ان کے پاس جاؤں گی بھی نا۔ پھر ان کے سامنے جا کر ان کی باتوں کا خیال آویگا۔ ان کے حق ناحق کا خیال مجھے ستائے گا!!
کنتی :- (جاتی ہوئی) بہتر ہے۔

دوسرا سین

(ایک کمرہ جس کے ایک کونہ میں ٹوٹی پھوٹی میز ٹپی ہے میز کے اوپر کاندیوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ بہت سے کاغذ بے ترتیب پڑے ہوئے ہیں۔ میز کے دو طرف الماریاں ہیں)

جن میں کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

سرن ان کتابوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ ان کتابوں پر سے نظر ڈال کر وہ ان کاغذوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے ان کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہے پھر کرسی پر بڑھال ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔

سیوا کمرہ کے اندر داخل ہوتا ہے۔ سرن کا سلسلہ خیال ٹوٹ جاتا ہے ایک نظر سیوا پر ڈال کر وہ میز کی طرف جاتا ہے اور بے ترتیبی سے سہارے کاغذوں کی گڈی سی بناتا ہے گڈی بناتے ہوئے اس نے سیوا سے پوچھا)

سرن :- کیا ہے سیوا۔

سیوا :- چلا آیا بابو جی آپ کو دیکھنے۔ آپ کو کسی کام کی ضرورت ہو تو مجھ سے۔۔۔۔۔

سرن :- کسی کام کی ضرورت نہ پڑے گی۔ (کاغذوں کی گڈی باندھتا ہوا) اگر پڑے گی تو

سیوا :- میں ہر وقت حاضر ہوں۔

سرن :- ہاں، ویسے تو کتنی ہی سارا کام کر جاتی ہے!۔ تمہیں دو تین مہینہ سے ایک بھی کام نہیں ملا؟

سیوا :- میں اس کے لئے نہیں آیا ہوں بابو جی۔ آپ اس بات کی ذرا بھی فکر نہ کیجئے۔ جب آپ کے پاس ہوں گے آپ دے ہی دیں گے۔ ہمیں تو آپ کی تکلیف کی فکر ہے۔

سرن :- تم۔ وہ روکھی ہنسی ہنستا ہے (تم جسکے اوپر میرا کوئی حق نہیں۔ وہ میری فکر کرے! اور جس کے اوپر میرا سب کچھ حق ہے وہ اپنے مطلب کے سوا اور کچھ نہ سوچے۔ اچھا تمہارا کیسے شکریہ ادا کروں!

سیوا مجھے کوئی تکلیف نہیں!

سیوا :- آپ اکیلے نہ رہا کیجئے بابو جی۔ اکیلے میں بُرے بُرے خیالات دماغ میں آتے ہیں۔

سرن :- ہاں یہی ہوتا ہے! آج ساری رات۔

سیوا :- آپ سوئے نہیں؟۔ آپ کی آنکھیں!۔ سرن :- کچھ نہیں سیوا! دل کی باتوں کو لبوں پر لانا زخموں پر اور تک چھڑکنا ہے!

(بہت سے کاغذ وہ ان گڈی میں ڈالتا ہے اور اس میں دیا سلائی سے آگ لگا دیتا ہے۔ کاغذ ایک دم جل اٹھتے ہیں)

سیوا :- آگ کیا کریں گے بابو جی؟

(سرن کاغذ کی گڈی کو آگ میں ڈالنے جاتا ہے)

یہ کیا کرنے جا رہے ہیں آپ۔

سرن :- ایک دنیا کو جلا کر دوسری دنیا آباد کرنے!

سیوا :- آپ ان کو نہ جلائیے۔

سرن :- بغیر جلائے آپ کام نہ چلے گا۔ بہت رہ لیا اس

دنیا میں۔ اب دوسری دنیا میں رہنا چاہتا ہوں یہ دنیا جہاں کہ ہم تم شرمی سب رہتے ہیں۔ اجڑی ہوئی ہے اس دنیا کی خوشی سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ میں ان کی ذرا بھی فکر نہیں کرتا ان سے ذرا بھی پریم نہیں کرتا۔ وہ نہیں جانتیں کہ میں ان سے کتنا پریم کرتا ہوں وہ یہ بھی نہیں جانتیں کہ جب وہ مجھ سے جدا ہونے کی کوشش کرتی ہیں تو میرے دل پر کیا گور جاتی ہے!۔ اب میں ان کاغذوں کو جلا کر اپنی اصلی دنیا میں رہنے لگوں گا۔

سیوا:- آپ ان کاغذوں کو بہت سنبھال سنبھال کر رکھتے تھے!

سرن:- ہاں۔ ان کو دل سے لگا لگا کر رکھتا تھا۔ ان کو دل و جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ مگر اب ان کو اپنے پاس رکھنے کی کوئی امید نہیں۔ اب میں رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ جتنی جلد یہ میری آنکھوں کے سامنے خاک ہو جاویں اچھا ہے! — تم دیکھتے تھے سیوا میں زیادہ تر اسی کمرہ میں بیٹھا رہتا تھا، یہیں، اسی کرسی پر، اسی میز کے سہارے۔ یہیں دیواروں سے باتیں کیا کرتا تھا۔ یہ مجھ سے گفتگو کرتی ہوئی معلوم دیتی تھیں!

سیوا:- یہ وہی کاغذ ہیں جن میں آپ کے سرن:- ہاں میرے افسانے قلمبند ہیں!

سیوا:- تو آپ ان کو نیست و نابود کرنے کیوں جا رہے ہیں۔ آپ کو تو ان کو دل سے لگا کر رکھنا چاہیے تھا

سرن:- چاہتا تھا کہ ان کو دل سے لگا کر رکھوں۔

سیوا:- تو آپ ان کو جلائیے نا؟ میں ان کو جلانے نہ دوں گا۔

سرن:- نہیں بھائی۔ ان افسانوں کو اب آگ ہی میں ڈالنا ہے۔ اور آج ہی۔ ورنہ زندگی اور تلخ ہو جاوے گی!

سیوا:- زندگی اور تلخ ہو جاوے گی! یہ کیسے؟

سرن:- ہاں، ان سے اب اور زیادہ زندگی تلخ ہو جاوے گی پہلے میں سمجھتا تھا کہ دل کے بہلانے کا یہ اچھا مشغلہ ہے! شاید ان کو جلا کر میں شری کو خوش

کر سکوں گا۔ ان میں محو رہ کر میں شری سے محبت نہیں کر سکتا!

سیوا:- بنی بی جی سے؟

سرن:- میں ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا! سیوا:- کیا۔

سرن:- میں نے شری کو اکیلا رہنے پر چھوڑ دیا ہے! سیوا:- نہیں؟

سرن:- ان کو کسی کی دولت کی ضرورت نہیں! سیوا:- کیا سچ ہے؟

سرن:- ان کے پاس ماں باپ کی زمینداری ہے! سیوا:- کیا وہ ایسا خیال کرتی ہیں!

سرن:- ان کے اوپر میرا کوئی حق نہ رہا! سیوا:- ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا!

سرن:- ان کو میری ضرورت ہی نہیں رہی! سیوا:- ہاں!

سرن:- شری ایسا ہی خیال کرتی ہے۔ ان کے دل میں کل ایسے ہی خیال بھرے تھے۔

سیوا:- ایسا ان کو کبھی نہ سوچنا چاہئے تھا۔ ایسا سوچنا ان کے لئے پاپ ہے! گناہ ہے۔ ہائے زمانہ

زمانہ ہی کا کھوٹ ہے بالوچی۔ ایسی ہی ہوا ساری دنیا میں چل گئی ہے۔ وہ شاید غرور و غصہ میں اندھی ہو رہی ہیں۔

سرن:- اندھی! ہاں ہوں گی، مجھے کیا معلوم۔

سیوا:- اندھے کو اگر ایک بار ٹھوکر لگتی ہے تو وہ گرتا ہی چلا جاتا ہے!

سرن :- کچھ دیر سوچ کر گمراہ گونے سے بچ سکتی ہیں !

سیوا :- بچ سکتی ہیں !

سرن :- تجھے یقین ہے میں ان کو بچا سکتا ہوں ! ان کو

راہ پر لاسکتا ہوں ! میں سمجھتا ہوں وہ آجکل

اپنے بس میں نہیں۔ اگر اپنے بس میں ہوتیں تو

کبھی ایسا نہ کرتیں۔ تم یہیں رہنا سیوا۔

(دروازہ پر جاتا ہے)

سیوا :- آپ کہاں جا رہے ہیں۔

سرن :- (دروازہ پر سے) تم یہیں رہنا۔

سیوا :- آپ کہاں جا رہے ہیں !

سرن :- شری کے پاس جا رہا ہوں۔

سیوا :- وہ آپ کو نہ ملیں گی !

سرن :- کیا ابھی تک ان کے کمرہ کے دروازہ کے کواڑ بند ہیں

سیوا :- آپ کس کے پاس جا رہے ہیں۔ شری بی بی تو کبھی

کی یہاں سے گئیں۔

سرن :- (کمرہ کے اندر آکر) شری گئی ! شری اس طرح نہیں

جاسکتی !

سیوا :- وہ کتنی کے ساتھ گئیں۔ کتنی اور وہ دونوں کبھی کی

چلی گئیں۔

سرن :- شری گئی !

سیوا :- سوچ نہ کرئے۔

سرن :- مجھ سے مل کر کبھی نہیں گئی ! شری شری تجھے

کیا ہو گیا۔

(سرن کرسی میں ٹڈھال ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ چاروں

طرف سکوت کا عالم ہے۔ باہر کمرہ کے کسی کے جوتوں کی

آواز آتی ہے، سیوا باہر جھاکتا ہے۔ کسی کی آواز آتی ہے

”سرن باہر ہیں“

سرن :- کون ہے ؟

سیوا :- ایک شخص آپ کو پوچھتا ہے !

سرن :- آنے دو۔

(دیال اندر آتا ہے)

دیال :- آداب عرض ہے سرن باہر۔

سرن :- آداب عرض۔ تشریف لائیے، میری کتاب کا کیا

ہوا ؟ اگر نہ چھپی ہو۔

دیال :- ہاں ؟

سرن :- تو اسے جلا ڈالئے !

دیال :- جلا ڈالئے کیوں ؟۔ ایسی کتاب کیا روز روز لکھی

جاتی ہے وہ تو چھاپے خانے میں پہنچ چکی ہے

اور غالباً دو چار دن میں شائع ہو جائے گی۔

اس کتاب کا میں روپیہ دینے آیا ہوں !

سرن :- اب کچھ ضرورت نہیں۔

سیوا :- لے لیجئے باہر جی۔

سرن :- کس کے لئے لوں ؟

سیوا :- شاید شری بی بی واپس آجاویں۔

سرن :- ان کو واپس لانے کی امید ہے ؟

(روپیہ لے لیتا ہے اور رسید لکھ کر دیتا ہے)

کتی دیر ہوئی ان دونوں کو یہاں سے گئے۔

سیوا :- قریباً تیس چالیس منٹ ہوئے ہوں گے۔

سرن :- تو کیا اسٹیشن پر میں ان کو پکڑ سکتا ہوں ؟۔

اچھا معاف فرمائیے دیال باہر اسوقت نہایت

اہم کام سے اسٹیشن جا رہا ہوں۔ آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔

بڑھیا :- وہ شری سے ہمیشہ پریم سے بولتا تھا مگر شری کا منہ ٹیڑھا ہی رہتا تھا۔

(سرن جلدی سے کوٹ پہنچا ہے اور ننگے سر کردے باہر نکل جاتا ہے)

دوسری عورت :- آج سرن کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی۔

دیال :- کہاں گئے۔ آج ان کی عجیب حالت ہے۔

سیوا :- ہاں۔ کل رات سے بڑی مصیبت میں پھنس گئیں ہیں (مکان کے اندر سے آواز آتی ہے شری! شری! یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ "گھر میں کوئی بھی نہیں")

دیال :- کاندی گڈی کو دیکھ کر۔ یہ کیا ہے۔

سیوا :- سرن! ابو آج اسے آگ میں جھونکنے جا رہے تھے

دیال :- اس کو میں لے جاتا ہوں۔ ان سے کہدینا۔

بڑھیا :- سرن کو اب اکیلا چھوڑنا۔ نہ جانے کیا دل میں آجائے

سیوا :- ناماجی۔ میں ان کو اکیلا چھوڑوں گا!

(دروازہ سے دو آدمی اندر گھستے ہیں ان کے پیچھے معلوم ہوتا ہے کہ تین چار آدمی اور ہیں جو کسی چیز کو اپنے ہاتھوں میں سنبھالتے لارہے ہیں)

ایک آدمی :- ذرا دھیرے دھیرے لانا۔ چوکھٹ سے کسی کو

ٹھوکر نہ لگ جاوے۔

(سب کی نگاہ ان آدمیوں کی طرف جاتی ہے وہ چارپائی پر ڈالے ہوئے سرن کو اندر لاتے ہیں اور صحن میں لٹا دیتے ہیں)

سیوا کے منہ سے نکل جاتا ہے "یہ تو سرن ہیں!"

ارے یہ کیا ہوا۔

سرن بالکل بے ہوش پڑا ہوا ہے اس کے سر سے

خون جاری ہے اور سارا بدن لہو سے رنگا ہوا ہے)

ایک آدمی :- تم ان کے ٹوکر ہو؟

سیوا :- ہاں۔

آدمی :- ان کا یہاں کوئی اور نہیں ہے۔

تیسرا سین

(مکان کا صحن جس میں کئی عورتیں کھڑی ہیں)

ایک بڑھیا :- بھلا ایک عورت کا اپنے خاوند سے ایسا برتاؤ

ہونا چاہئے۔ روپیہ پیسہ آدمی کا جنم بھر ساکتہ

تھوڑے ہی دیتا ہے۔ اپنے آدمی کی تو مرتے

وقت تک ضرورت پڑتی ہے! دولت کے گھمنڈ

میں اپنے مالک کو چھوڑ کر جانا بڑی بے نصیبی ہے۔

اس کا آدمی تو بالکل گنوا ہے!

دوسری :- میں بھی جب اپنے خاوند سے تنگ آ جاتی ہوں تو

ان سے کہتی ہوں کہ تمہیں ایک تنکا اٹھا کر

نہ دوں گی۔ مگر بعد کو ہاتھ ملتی ہوں کہ میں نے

کیوں ان کا دل دکھایا۔ مگر شری کا پتی تو

بڑا نیک ہے۔

گئے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں اس کے پاس صرف ۲۰۰۰ مشینیں تھیں لیکن اب ان میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں وہ ہوائی جہاز فراہم نہ کرتا ہو اور اپنے یہاں کے انجنیئر نہ بھیجتا ہو۔ امریکہ کی جار و وقوع ایسی ہے کہ وہ بڑی حد تک تمام خطروں سے مطمئن ہے۔ مغربی سواحل کی طرف اسے جاپان سے ضرور اندیشہ ہے سو وہاں اس نے بڑے زبردست استحکامات کر لئے ہیں اور یورپ کی موجودہ سیاسیات کو دیکھ کر پریسیڈنٹ روزولٹ نے دس ہزار مزید مشینوں کی منظوری دیدی ہے۔

اب برطانیہ کا حال سنئے جس سے ہمیں حملہ ہندوستان کے وقت واسطہ پڑنا ہے۔ گزشتہ سال وزارت حربیہ کی طرف سے جو رپورٹ شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں برطانیہ کے پاس ہر قسم کے ہوائی جہازوں کی مجموعی تعداد ۲۰۴۴ تھی اور اس میں بھی ۵۰ فی صدی تقریباً بیکار، لیکن بعد کو جب جرمنی کی طرف سے خطرے پیدا ہوئے تو ۱۹۳۸ء میں ۸۵ ملین پونڈ منظور کئے گئے تاکہ دو ہزار مشینیں اور طیارے کی جائیں، لیکن برطانوی کارخانوں کی صنعت اس قدر سست ہے کہ سال کے آخر تک مجوزہ تعداد کی نصف مشینیں بھی طیارے ہو سکیں۔ ۱۹۴۵ء مجوزہ ہوائی اسٹیشنوں میں سے صرف ۲۶ ۱۹۳۶ء کے آخر تک بن سکے اور ماہوار ۱۰۰ مشینوں سے زیادہ طیارے کر سکے، برخلاف اس کے جرمنی نے اسی دوران میں ۴۴ ہزار مشینیں طیارے کر لیں اور ۲۸۰ ہوائی اسٹیشن بنائے۔

اب سال حال کے بجٹ میں ۲۰۰ ملین پونڈ منظور کئے گئے ہیں لیکن ۱۹۳۹ء کے آخر تک ۴۰۰۰ سے زیادہ جہاز نہیں بن سکتے۔ اور اگر امریکہ سے خریدے بھی گئے تو جرمن کی قوت تک پہنچنا دشوار ہے کیونکہ اب آسٹریا اور زیکو سلوویکیا کی قوت بھی اسی کی قوت ہو گئی ہے اور اس طرح اس کے ذرائع بہت زیادہ وسیع ہو گئے۔

تدائیر تحفظ و مدافعت کے باب میں انگلستان سے زیادہ کمزور ملک کوئی نہیں۔ اس کے متعدد اسباب ہیں۔ اول تو انگلستان کی آبادی میں ابھی تک اس کا پورا احساس پیدا نہیں ہوا کہ آئندہ جنگ میں ہوائی قوت کو کتنی اہمیت حاصل ہوگی، اسی لئے ان میں کوئی خاص جوش و میلان فن پرواز کی طرف پیدا نہیں ہوا۔ دوسرے اگر کسی خاص جماعت میں اس کا احساس پیدا ہوا بھی ہے تو وہاں کے اندونی حالات ایسے ہیں جو تیزی سے آگے قدم بڑھانے نہیں دیتے۔

ہوائی تاخت کے مقابلہ کے لئے، طیارہ شکن توپوں اور محافظ گیس نقابوں کی بڑی ضرورت ہوتی ہے لیکن انگلستان کی طیارہ شکن توپیں بھی تجربہ سے ناقص نکلیں اور نقاب بھی زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگلستان اپنی خام پیداوار کے لحاظ سے بہت قیمت واقع

ہوا ہے اور اُسے ضرورت ہوتی ہے کہ بیرون ملک سے ضروریات زندگی فراہم کرنے کے لئے ان کارخانوں کو بدستور قائم رکھے تاکہ اس کا میزانیہ درآمد و برآمد استوار رہے اور اسی لئے وہ اپنی عسکری قوت بڑھانے میں سب سے پیچھے نظر آتا ہے۔

وہ لوگ جو حقیقت سے واقف نہیں ہیں، انگلستان کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں، لیکن اس کی اندرونی حالت نہایت تشویشناک ہے اور اسی لئے مسٹر چیپرلین یورپ میں آتش جنگ کو مشتعل دیکھنا نہیں چاہتے کہ مبادا انگلستان بے نقاب ہو جائے اور اس کا تھوڑا بہت بھرم جو باقی رہ گیا ہے وہ بھی جاتا رہے۔

جنوری ۱۹۳۹ء کا نگار

نظیر اکبر آبادی نمبر ہوگا

جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر فہرست اس سے قبل کی اشاعت میں دی جا چکی ہے۔ وہ اہل قلم جو نظیر اکبر آبادی سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں اس میں حصہ لینے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس وقت تک حسب ذیل عنوانات تقسیم ہو چکے ہیں:-

نظیر و کبیر	=	پروفیسر فراق گورکھپوری ام۔ اے
نظیر اور اردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز	=	پروفیسر مجنوں گورکھپوری ام۔ اے
نظیر تذکرہ نویسوں کی نظر میں	=	مولوی امیر احمد صاحب علوی۔ بی۔ اے
نظیر کا مذہبی مسلک	=	ل۔ احمد اکبر آبادی
نظیر کی ہندو اور انہ نظمیوں	=	ڈاکٹر لکشمی دت صاحب
نظیر کے تلامذہ اور ہم عصر اساتذہ	=	جناب مفتی انتظام علی صاحب اکبر آبادی
نظیر کے لسانی اختراعات و ادبی احسانات	=	مولانا عبدالباری آسی
نظیر کا فلسفہ زندگی و نظریہ اخلاق	=	جناب مخمور اکبر آبادی بی۔ اے
عنوانات مقرر نہیں ہیں ہر شخص اپنے لئے علیحدہ عنوان تجویز کر سکتا ہے۔ اکتوبر تک مقالات کتبہ پونچ جانا ضروری ہے		نیاز

کیا آپ کو معلوم ہے

نوبل پرائز کیا ہے

سویڈن کا ایک امیر تھا جس کا نام الفرڈ برن ہارڈ نوبل تھا (وفات ۱۸۹۶ء) اس نے سب سے پہلے ۱۸۸۶ء میں ڈائنامیٹ اور تغیر دھویں کی بارود بنائی اور اسی طرح کے اور آتشگیر مادوں کی صنعت سے بڑی دولت جمع کی۔ اس نے مرتے وقت وصیت کی کہ اس کی جمع شدہ دولت کے سود سے پانچ انعام ۵۰، ۵۰، ۵۰ ہزار پونڈ کے دئے جائیں ان میں سے چار انعام ہر سال طبیعیات، کیمیا، شریح الابدان اور علم العقاقیر (ادویہ) کے بہترین اکتشافات پر دئے جاتے ہیں اور پانچواں انعام بہت مشہور ہے اس شخص کو دیا جاتا ہے جو دنیا کے امن و سکون کی اشاعت میں سب سے زیادہ مدد دے۔

ان انعامات میں قومیت و جنسیت کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ امن والا انعام بڑا مشہور و ہم انعام ہے جو ناروے کی مجلس مقننہ دیتی ہے اور باقی چار سویڈن کی مجلس اکادمی کی طرف سے تجویز ہوتے ہیں۔ یہ انعامات ہر سال ۱۰ دسمبر کو دئے جاتے ہیں جو الفرڈ نوبل کے مرنے کی تاریخ ہے۔

باغ عدن کہاں تھا

بائبل کے طلبہ کے سامنے بہت عرصہ سے یہ سوال زیر غور رہا ہے کہ باغ عدن جس کا ذکر بائبل میں پایا جاتا ہے، کہاں تھا۔ بائبل کے باب خروج میں جن چار دریاؤں کا ذکر ہے ان کی تفصیل مفسر نے دجلہ، فرات، فاسین اور اراکسین بتائی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ انہ چار میں سے

ایک دریائے نیل ہے اور باغ عدن ایک ایسے قطعہ زمین پر مشتمل تھا جس کا ایک حصہ ایشیا میں تھا اور دوسرا افریقہ میں۔

بابلی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایسی جگہ تھی جہاں انسان نے سب سے پہلے روشنی کو دیکھا اور اس بابلی میدان کا نام سمیری زبان میں ادینو تھا جو قدیم زمانہ کا ایک شہر تھا اور خلیج فارس پر واقع تھا۔ روایت ہے کہ اس باغ میں ایک ”شجر حیات“ پایا جاتا تھا اور ایک دریا جس کے چار دہانے تھے۔

اب عام خیال یہی ہے کہ باغ عدن اس قطعہ زمین میں پایا جاتا تھا جو خلیج فارس کے پاس والے دریاؤں کے ساحل پر تھا۔ بابل میں دو اور مقامات کو بھی عدن لکھا ہے جن میں سے ایک دمشق کے پاس بتائی جاتی ہے، لیکن باب خروج والی جنت عدن وہی ہے جس کا پہلے ذکر کیا گیا۔

مقناطیسی قطب شمالی کہاں ہے

شمالی امریکہ کے انتہائی شمال میں ایک جزیرہ نما ہے جس کا نام بوٹھیا فلکس ہے اور کناڈا میں واقع ہے۔ یہیں مقناطیسی قطب شمالی پایا جاتا ہے۔ اس کو ۱۸۲۹ء میں سر جیمس راس نے متعین کیا تھا، لیکن یہ قطب قائم نہیں ہے اور اس کا طول البلد و عرض البلد بدلتا رہتا ہے۔ جنوب کا مقناطیسی قطب نیوزیلینڈ کے انتہائی جنوب و کٹوریا لینڈ میں پایا جاتا ہے۔ اسے ۱۹۰۹ء میں شیکلٹن نے دریافت کیا تھا۔

جغرافیہ کے قطب شمالی و قطب جنوبی ان سے علیحدہ چیزیں ہیں۔

بجلی کس نے دریافت کی

قدیم زمانہ کے لوگ اتنا جانتے تھے کہ اگر کہربا کے ٹکڑے کو کسی چیز سے رگڑ دیں تو وہ ہلکی ہلکی چیزوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ انکشاف مسیح سے تقریباً ۶۰۰ سال قبل تھیل ملی شل نامے کسی یونانی فلاسفر نے کیا تھا جو اپنے زمانہ کا بڑا مشہور ریاضی داں اور ماہر فلکیات تھا۔ اس کے صد ہا سال بعد تک یہی یقین کیا جاتا رہا کہ کہربا ہی صرف ایسی چیز ہے جس میں یہ قوت

کشش پائی جاتی ہے چنانچہ الیکٹریسیٹی (Electromagnetism) کا لفظ ہی اس کا ثبوت ہے کیونکہ یہ یونانی لفظ الیکٹرون (Electron) سے ماخوذ ہے جسکے معنی کہر یا بجلی ہیں۔ اس کے ۲۲ سو سال بعد گلیکٹ نامے ایک انگریزی طبیب نے ثابت کیا کہ شیشہ وغیرہ میں بھی رگڑ سے یہی قوت کشش پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی کے وسط میں فرانکلن نے ثابت کیا کہ شیشہ اگر ریشم سے رگڑا جائے تو منفی (Negative) قسم کی بجلی پیدا ہوتی ہے اور لاکھ کو فلائین سے رگڑا جائے تو مثبت (Positive) قسم کی بجلی پیدا ہوتی ہے۔

آفتاب میں کیا کیا دھاتیں ہیں

آفتاب کے مشتعل کرہ میں بہت سی وہ دھاتیں پائی جاتی ہیں جو کرہ زمین میں بھی نظر آتی ہیں۔ اور اس کا ثبوت اس طرح مل سکتا ہے کہ اگر آپ کرن کا تجزیہ کریں یعنی اگر شعاع آفتاب کو کسی مثلثی شیشہ سے گزار کر دیکھا جائے تو مختلف رنگ کے حلقے پیدا ہوتے ہیں، یہ رنگین حلقے ان مختلف دھاتوں کے ہیں جن کو اگر جلا کر گیس بنایا جائے تو اسی قسم کے رنگ ان سے نمودار ہوں۔ اس وقت تک آفتاب میں جن عناصر یا دھاتوں کا پتہ چلا ہے ان کے نام یہ ہیں:۔ ہائیڈروجن ہیلیم۔ کیلشیم۔ سوڈیم۔ مگنیشیم۔

سب گہرا سوراخ زمین کا کہاں ہے

پٹرول کے چشمے اور بعض معدنیات زمین کی گہرائی کے اندر پائے جاتے ہیں اور ان تک پہنچنے کے لئے زمین میں بڑے بڑے برموں کے ذریعہ سے سوراخ کئے جاتے ہیں، چنانچہ کلیفورنیا میں تیل نکالنے کے لئے ایک سوراخ ڈیڑھ میل گہرا کیا گیا ہے اور اس سے زیادہ گہرائی تک کوئی انسان اس وقت تک نہیں پہنچ سکا۔

نیلے رنگ کے پھول کیوں کم ہوتے ہیں

ماہرین علم نباتات کا نظریہ ہے کہ نیلگوں رنگ کے پھول انتہائی ارتقائی حالت کے پھول ہیں

اور اسی لئے کم پائے جاتے ہیں۔ زرد رنگ کے پھول انتہائی ادنیٰ حالت کے پھول سمجھے جاتے ہیں اور گلہابی، سرخ یا ارغوانی درمیانی حالت کے ہیں۔

جب آفتاب کی شعاعیں درخت پر پڑتی ہیں تو درخت کے خلیا یا انھیں جذب کرتے ہیں۔ کرن مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے اور جن رنگوں کو یہ خلیا جذب نہیں کر سکتے اور واپس کر دیتے ہیں وہی پھول میں نمودار ہو جاتے ہیں۔

آسمان کا رنگ کیا ہے

ہم آسمان کے رنگ کو نیلا کہتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ آفتاب کی شعاعوں میں خاک کے ذرات کی وجہ سے جو انتشار اور انعکاس و انکسار (Reflection + Refraction) پیدا ہوتا ہے وہ اس رنگ کی جھلک کو نمایاں کر دیتا ہے، ورنہ حقیقت میں آسمان یا فضا کا کوئی متعین رنگ نہیں ہے۔ آسمان کا یہ نیلگوں رنگ صرف ۶،۵ میل کی بلندی تک نظر آتا ہے، اس کے بعد سیاہی مایل نیلا معلوم ہوتا ہے۔ آٹھ میل کی بلندی سیاہی مایل بنفشی نظر آتا ہے، بارہ میل پر نیلگوں بنفشی ہو جاتا ہے اور تیرہ میل پر سیاہی مایل بھورا۔

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

تاریخ اسلامی ہند جو نگار میں جزاً جزاً جنوری تا دسمبر ۱۹۳۸ء شائع ہو چکی ہے اس کے کچھ فارم گئے گئے تھے۔ چنانچہ اب وہ کتابی شکل میں طیار ہے وہ اصحاب جو نگار کے خریدار ہیں لیکن انہوں نے علاوہ تاریخ علیحدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، و نیز وہ اصحاب جو نگار کے خریدار نہیں ہیں اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ کتاب مع توقیت ۴۴۲ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت مع محصول ۱۲ روپے ہے۔

مینجر نگار - لکھنؤ

سیوا :- ان کی تپتی شری آج ہی اسی گاڑی سے اپنے گھر چلی گئی ہیں۔

آدمی :- تو ان کے پاس اب کوئی نہیں !

بڑھیا :- ہم سب ہیں تو سرن کی دیکھ بھال کریں گے۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ ہوا کیا۔

آدمی :- یہ اسٹیشن پر ریل میں کسی کو تلاش کر رہے تھے۔

ریل نے پہلی سیٹی دی تو ان کی پریشانی اور بڑھ گئی، ان کی نگاہ یکایک ایک ڈبہ پر جا پڑی۔

یہ اس کی طرف دوڑے انھوں نے ایک عورت

کو کاغذ دیا۔ اور کچھ جلدی سے کہا، صرف میں نے

اتنا سنا کہ جلدی کرو۔ گاڑی چھٹنے والی ہے۔ اب تو

سب کچھ ہو جاوے گا۔ تمہیں اسی کی فکر تھی۔ گلاس

عورت نے اس کاغذ کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا

میں نے دیکھا تو کسی بنک کا چیک تھا۔

سیوا :- پھر؟

آدمی :- یہ پلیٹ دم پر کھڑے ہوئے۔ لہجائی موٹی نکال

سے ریل کو دیکھ رہے تھے۔ ریل پلیٹ فام سے

نکلنے لگی۔ جیسے ہی آخری ڈبہ نکلا انھوں نے

اس کو پکڑ لیا ریل تیز ہو چکی تھی۔ اس لئے گھر پر

اور یہ حال ہو گیا !

سیوا :- (بڑھیا سے) آپ ان کے بھائی کا تو پتہ

جانتی ہیں !

بڑھیا :- ہاں۔ میں ابھی اسے ملواتی ہوں !۔ تو شری کے

پاس دوسری گاڑی سے جا اور اس اندھی سے کہہ

کہ اپنے بچے کی حالت آکر دیکھ لے۔

تیسرا ایکٹ

(پہلا سین)

(شیورانی، شری کی ماں جس کے سفید بال بتا رہے ہیں

کہ دنیا میں وہ اپنی زندگی کا بڑا حصہ ختم کر چکی ہے، بیٹھی ہوئی۔

سوت کات رہی ہے اور کنکھیوں سے سب عورتوں اور لڑکیوں

کو دیکھتی جاتی ہے۔ اس کی سنجیدہ نظر بتا رہی تھی کہ وہ لڑکیوں

کے چلبے پن سے کوسوں دور رکھ گئی ہے۔)

لڑکیوں کی آواز :- کھی کھی کھی !

(بڑھیا نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتی ہے پھر اونہ، کہہ کر

سر جھکانے کو ہوتی ہے کہ اپنی دیورانی موٹی کو آتی ہوئی دیکھتی

ہے۔ اس کی عمر چالیس برس کے قریب ہو گئی)

شیورانی :- کیا شرارت میا رکھی ہے انھوں نے؟

موٹی :- اس بچاری کو تنگ کر رکھا ہے وہ تو اس مرتبہ

بڑی سیدھی بن کر آئی ہے۔ کچھ بول ہی نہیں رہی ہو

شیورانی :- ابھی ابھی آئی ہے ! شرما تی ہو گئی۔

(شری آتی ہے اور چپ چاپ اپنی ماں کے پاس

بیٹھ جاتی ہے)

شیورانی :- تو وہاں سے کیوں چلی آئی؟

شری :- یونہی، طبیعت نہیں لگی

(دو عورتیں اور آتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں شری ان کی

طرف دیکھتی ہے اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ کنتی آتی ہے)

کنتی :- میں تلاش کر رہی تھی تمہیں !

عورت :- سرن یا تو اچھے ہیں؟

(شری کا منہ فٹ ہو جاتا ہے)

کنتی :- اچھے ہی ہیں !

دوسری :- شری تو آہی گئی۔ کیسے آنا ہوا

شری :- ویسے ہی چلی آئی۔

مونی :- سبوں کو دیکھنے کو دل چاہا ہوگا۔ آگئی !

دوسری :- سرن بابو ساتھ نہیں آئے !

کنتی :- نہیں۔

(شری کانتی کا ہاتھ پکڑ کر چلی جاتی ہے۔ سہیلی بھی انکے

پچھے ہو جاتی ہے)

دوسری :- کیوں نہیں آئے۔

کنتی :- نہیں۔ شری بی بی نے ایک دم یہاں آنے کا

ارادہ کر لیا۔ وہ نہ آسکے

شیورانی :- ان کو آنا چاہئے تھا ساتھ۔

کنتی :- شری بی بی مانی ہی نہیں۔

شیورانی :- شری مانی نہیں ؟ تو صاف صاف نہیں بتا رہی

شری :- نہیں بی بی جی صاف تو کہہ رہی ہے۔

(شیورانی کنتی کو لیکر چلی جاتی ہے)

ایک :- کچھ دال میں کالا ضرور ہے ! کنتی کہتے کہتے رہ گئی !

دوسری :- نہ معلوم کیا بھید ہے۔ شری کا اس طرح سے آناؤ

سرن کا ساتھ نہ آنا۔

ایک :- بڑی حیرت کی بات ہے، میں سنتی ہوں کہ شری

کی سرن سے نہیں بنتی !

دوسری :- تو نہ بننے پر سرن سے الگ ہو آئی۔ ایسا کرنا تو ناممکن

سا معلوم ہوتا ہے۔ دنیا اسے کیا کہے گی ؟

ایک :- ارے آجکل تو ہر ناممکن ممکن ہو گیا ہے۔ دنیا کے

کپنے کی کسے پرواہ ہے !

دوسری :- اس کی شکل ہی سے مجھے شک ہو گیا تھا۔ جب

سرن کا نام آیا تو اس نے منہ پھیر لیا

ایک :- شک تو مجھے بھی ہوتا ہے۔

(شیورانی اور کنتی آتی ہیں)

شیورانی :- (کنتی سے) تو نے تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین

نکال دی۔ شری نے بہت برا کیا۔ دنیا کیا کہے گی۔

کنتی :- ان کو سمجھا بھجا کر واپس بھیج دیجئے۔ میں بھی ان کو

سمجھانے کی کوشش کروں گی۔

(شری آتی ہے)

شری :- کیا ہے ماں۔

شیورانی :- میرے ساتھ آ۔

(شری اور شیورانی چلی جاتی ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد

کنتی اور شری باتوں میں مصروف نظر آتی ہیں)

کنتی :- آج تنہائی کیوں پسند آرہی ہے !

شری :- سب اپنی اپنی باتوں میں لگی ہوئی ہیں اور ان کے

ساتھ تھی تو میں !

کنتی :- ان کے ساتھ تھیں ضرور مگر ان سمجھوں سے بچنے کی

کوشش کر رہی تھیں۔

شری :- تجھے وہم ہے !

کنتی :- وہم نہیں بی بی جی مجھے۔ میں تمہارے دل کی بات

جان جاتی ہوں۔ میں تمہیں اس طرح نہ رہو دوں گی !

شری :- کیوں اکیلے رہنے میں کیا ہرج ہے۔

کنتی :- اکیلے رہنے میں آپ اور اُداس ہوں گی !

شری :- اُداس کیوں۔ اُداس ہونا ہوتا تو یہاں آتی

کیوں۔

ننتی :- پھر منہ پر یہ پھیکا پن کیوں ہے، ہونٹ کیوں بند

ہیں، ضرورتاً سوچتی رہتی ہو۔ میں بھانپ جاتی ہوں !

شری :- پھر وہی - کیا بھانپ لیا تو نے ؟

ننتی :- تمہارے چہرہ کے رنگ کا اتار چڑھاؤ بتا رہی

کہ تم -

شری :- کیا ؟

ننتی :- کہ تم کسی الجھن میں پھنسی ہوئی - کیوں ہے نا

یہ بات -

شری :- نہیں !

ننتی :- میں ان نہیں سکتی - کیا سوچ رہی ہو -

شری :- کچھ نہیں ! - وہی !

ننتی :- کیا ؟

شری :- جب گاڑی چل دی تھی تو تو نے کھڑکی میں سے

سر نکال کر دیکھا تھا -

ننتی :- میں نے نہیں دیکھا - میں تو اس وقت تمہیں دیکھ

رہی تھی !

شری :- مجھے کیوں دیکھ رہی تھی !

ننتی :- جب تم نے ان کا کاغذ پھینک دیا تو میں کتنی کی کتنی

رہ گئی -

شری :- اس وقت مجھے کچھ نہیں سوچ رہا تھا - میرے دل میں

تو ایک طوفان مچا ہوا تھا - لیکن میں نے کھڑکی

سے سر نکال کر دیکھا تھا -

ننتی :- "پھر ؟"

شری :- ایک آدمی کو بڑی جلدی سے ریل پر سوار ہوتے

دیکھا اور وہ ایک دم گر پڑا -

ننتی :- تو کیا تم یہ شک کر رہی ہو کہ وہ سر نہ باؤ تھے -

شری :- نہیں نہیں یہ شک نہیں ! - مگر -

(آہٹ سنائی دیتی ہے اور پھر شہبھوناتھ شری کے والد

کی آواز آتی ہے)

آواز :- راضی سے نہیں تو زبردستی !

(شری ٹپٹاتی ہوئی وہاں سے جاتی ہے کتنی بھی اس کے

پیچھے ہولیتی ہے اور دونوں درختوں کی آڑ میں کھڑے

ہو جاتے ہیں)

شہبھوناتھ :- ایسا تو کرنا ہی پڑے گا - اس کو یہاں سے فوراً

واپس بھیجنا پڑے گا - اس کو واپس جانا ہی چاہئے !

شیو رانی :- اسے بلا کر اس سے کیا کہوں - وہ بچاری پڑی -

شہبھوناتھ :- اسے بلا کر کہو کہ یہاں سے کتنی کے ساتھ واپس چلی

جائے اور کیا کہو گی ایسے وقت کچھ اور خیال

نہ کرنا چاہئے اگر ذرا بھی اسے عقل ہے تو اتنا

کہنے پر وہ یہاں ذرا بھی نہ رے گی !

(ملازم آتا ہے)

ملازم :- بابو جی ! ایک آدمی آیا ہے ؟

شہبھوناتھ :- کون ہے ؟

ملازم :- دروازہ پر کھڑا ہے !

شہبھوناتھ :- کہہ دو اس سے تھوڑی دیر میں آتے ہیں !

ملازم :- میں نے اس سے کہا - یہی مگر وہ بڑی جلدی میں

معلوم ہوتا ہے - بڑی گھبراہٹ میں - دو تین دفعہ

تو اس نے اپنے ہاتھ سے خطا کر دیا جو اس کے

پاس ہے ! کہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے

ملاقات کرنی ہے۔ اسی وقت - زندگی و موت
کا سوال بتاتا ہے !

(شب بھوناتہ لازم کے ساتھ چلا جاتا ہے - تھوڑی دیر
بعد شب بھوناتہ گھبرائے ہوئے آتے ہیں)

شب بھوناتہ :- ذرا اس خط کو تو سنو،

”سرن باوریل سے گر پڑے ہیں تمہیں کو واپس لینے
کے لئے وہ چلتی ہوئی ریل پر سوار ہو رہے تھے، اب
ان کی حالت اچھی نہیں ہے اگر کم سے کم انکی حالت تو دیکھ لو

تمہاری پڑوسن
مرلی“

شری اب کیا کرنا ہے ؟

(سب متعجب ہو کر شری کی طرف دیکھتے ہیں)

سرن بابو کا ملازم سیوا آیا ہے۔ جاؤ شری !

(شری کچھ نہیں بولتی ہے اس کا رنگ یکدم کانور ہو گیا)

اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس کے پیر

ڈمکاتے ہیں۔ کنتی اس کو سنبھال لیتی ہے)

کنتی :- بی بی شری !

کانتی :- ارے یہ تو بہوش ہوئی جاتی ہے !

(سب دوڑ کر اسے سنبھال لیتے ہیں)

شکر سروپ بھٹناگر

(باقی)

بلیک ڈائمنڈ

ہندوستان کا واحد بے ضرر خضاب

اس وقت بازار میں مختلف ناموں کے خضاب بہ کثرت نظر آتے ہیں، لیکن یہ تمام خضاب ایک ہی چیز ڈایا مین سے طیار ہوتے ہیں جو بے انتہا ارزاں چیز ہے، لیکن اس کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ماہ کے بعد چہرہ پر آماں آجاتا ہے، نزلہ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے، جلد پر دانے پڑ کر زخم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور بعض مرتبہ جب اس کا زہر آہستہ آہستہ خون میں پوری طرح سرایت کر جاتا ہے، ہلاکتیں بھی ہو جاتی ہیں، کیونکہ ڈایا مین نہایت ہی مہلک قسم کا زہر ہے اور صرف چمچا رنگنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ ہمارا خضاب ڈایا مین یا کسی اور زہریلی چیز سے بالکل پاک ہے اور اس کے استعمال سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ بالوں کو اصلی سیاہ رنگ دیکر واقعی چمک اور مضبوطی کو بھی قائم رکھتا ہے اور جلد پر دھتے بھی نہیں آنے دیتا۔ قیمت علاوہ محصول چھوٹا بکس ۴/-

بڑا بکس ۸/- ایک شیشی میں محصول ۶/- صرف ہو جاتا ہے، اس لئے جتنی زیادہ شیشیاں طلب کیجائیں گی اتنا ہی فائدہ

ہوگا۔ ہر شہر میں اینجیسیاں درکار ہیں۔ کمیشن کے متعلق خط و کتابت کیجئے۔

کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

بازداری

تاریخ بازداری کا آغاز معلوم کرنا ممکن نہیں۔ مسٹر ہارٹنگ (Hartung) لکھتے ہیں کہ ”شکاری پرندوں کا پالنا چین میں دو ہزار سال قبل مسیح رائج تھا“ قوانین الصیاد کے مصنف خدایار خاں عباسی کا بیان ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا ”بازدار“ ایرانی فرمانروا طہمورث تھا۔ شاہ نامہ فردوسی کے یہ اشعار اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

رمنده دژاں راہمہ بنگرید	سیہ گوش و یوز از سیاں برگزید
بچارہ بیاوردش از دشت و کوہ	بہ بند آمدند آں کہ بڈزاں گروہ
ز مرغال ہم آنکہ بد و نیک ساز	چو باتر و چو شاہین گردن فراز
بیاورد و آموختن بشاں گرفت	جہانے بد و ماندہ اندر شگرفت

۱۔ قوانین الصیاد یا جوارح نامہ امامیہ۔ طغان تیمور خاں دلی خراسان (۱۳۹۹ء تا ۱۴۰۵ء) کے عہد میں خدایار خاں عباسی نے تالیف کیا تھا جو شکار نامہ ایلمانی مرتبہ علی بنی منصور کا ترجمہ ہے، شکار نامہ ایلمانی صد نامہ ملک شاہی مصنفہ خواجہ ابوالجوارح نیشاپوری کی ترقی یافتہ صورت تھا۔

خدایار خاں کے قول کے مطابق یہ کتاب (جوارح نامہ امامیہ فی قوانین الصیاد) خراسان میں لکھی گئی اس وقت دلی کے تحت پر محمد تعلق ممکن تھا۔

اس کتاب کا جو نسخہ اس وقت ہمارے سامنے ہے اس کی زبان ”ہندوستانی فارسی“ ہے اور اس میں ”ہندی۔ سندھی اور پنجابی“ الفاظ اور اصطلاحات بھی بہ کثرت موجود ہیں۔

قوانین الصیاد کا یہ نسخہ جو لفٹنٹ ڈی سی فلٹ نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے ۱۹۰۸ء میں شائع کیا، یہ ان دو مخطوطوں کے باہمی مقابلہ کے بعد تیار کیا گیا تھا جن میں سے ایک ہربانی نس میر علی مراد بلوچ والی سندھ کی ملکیت تھا اور دوسرا نواب محمد افضل خاں کٹی خیل آن ٹائمک ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں کے قبضہ میں تھا۔

باوجود اس اہتمام اور چھان بین کے تصحیح کا حق ادا نہ ہو سکا اور اب بھی اس کا بہت سا حصہ الحاقی و جعلی ہے، کیونکہ باز نامہ داراشکوہ کا اقتباس (جو اس سے تین سو سال بعد کی تصنیف ہوگی) دکنی میٹر شکاروں کا ذکر سندھی۔ پنجابی اور ہندی الفاظ کی آمیزش، اس بات کی غمازی کر رہے ہیں۔

یہاں جوارح نامہ امامیہ کے چند اقتباسات پیش کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا، اس سے ایران کے اندر اس شوق کی تصویر ترقی کی رفتار کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ لکھتا ہے:-

”جمشید کے پاس لوگ وحوش و طیور پکڑ کر لے جاتے اور وہ ہر ایک کا نام رکھ دیتا۔ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسی نے اس فن میں پہلی کتاب لکھی اسکے جانشینوں نے بھی بقدر استعداد اس فن کی ترقی میں حصہ لیا۔ چنانچہ نوشیروان عادل نے اس فن کو غایت کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے تمام درباری اس فن میں فرد تھے۔ حکیم بزرجمہر نے اس کے حکم کے مطابق پہلوی زبان میں ”بازنامہ نوشیروانی“ مدون کیا اور یہی کتاب صدیوں تک میرٹکاروں کا دستور العمل بنی رہی۔

عبدالملک بن نوح سامانی (۳۴۲-۳۵۳ھ) دلی خراسان نے جو اس فن کا شیدائی تھا جوارح نامہ شہنشاہی کے نام سے بازنامہ نوشیروانی کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا۔

ملک شاہ سلجوقی (۴۶۵-۴۸۵ھ) کی شیفنگی کا یہ عالم تھا کہ شب و روز اسی دھن میں لگا رہتا۔ سفر ہو یا حضر۔ شکاری جانور اس کے ہمراہ رہتے اس کے ارکان سلطنت کا بازداری کی صفت سے متصف ہونا ضروری تھا۔ اس کے حکم کے مطابق خواجہ نظام الملک (وزیر اعظم) کی نگرانی میں نیشاپور، بلخ، مرز، مرو، ہرات، خوارزم، روم، عراق عرب، مصر، قبرز، اصفہان، سیستان، ترکستان اور ہندوستان کے ماہر فن بازداروں کی کانفرنس کا مل تین ہفتے ہوتی رہی جس میں اس فن کی تمام قدیم و جدید کتب فراہم کی گئی تھیں علی بن محمد نیشاپوری نے جو سرآمد بازداران عصر تھا ”صیدنامہ ملک شاہی“ اسی مؤثر کے نتیجہ کے طور پر مدون کیا۔ طغان تیمور خاں نے اس کتاب کا آسان اور سلیس فارسی میں شکارنامہ ایلمانی کی مدد سے ترجمہ کرایا اور اپنی طرف سے بیش بہا معلومات کا اضافہ کیا۔

۱۔ ان ماہران فن کے نام شہر دل اور ملکوں کی ترتیب کے مطابق یہ ہیں۔ خواجہ علی بن محمد، ابو الملک بلخی، ابو العباس بن فضل ترمذی، عبداللہ بن خالد مردی، تاشاہ ہراتی (ہردی) علی بن عبداللہ، حاجی بیگ رومی، خواجہ زکی، عبدالعزیز مصری، خواجہ محمد تبریزی، خواجہ زنگی اصفہانی، اسماعیل آتال، سیستانی، تالش ترک، سردباد بندی، صدق توس مغربی، یہ لوگ اس فن کے مختلف شعبوں کے امام تھے۔

۲۔ بازنامہ جاماسب - بازنامہ بقراط، رسالہ جالینوس - بازنامہ بزرجمہر، جوارح نامہ ابو النخعی، دہقان ماہکین، رسالہ ابو الفوارس - قیادری شکر، نامہ ابو الفرج باندہ، دہقان شکینی، صیدنامہ ابو زکریا، دہقان بخاری۔

۳۔ اول اول بازناموں میں چند مخصوص پرندوں کا ذکر ہوتا تھا۔ عبدالملک بن نوح کے بیٹے بھری کی شناخت کے متعلق ایک مضمون لکھ کر ابو النخعی کے جوارح نامہ میں اضافہ کیا تھا۔ اس سے پہلے بھری کا ذکر نہیں ہوا تھا۔ شاہین، شنقار اور ترقی ایران میں تاتاریوں کے ساتھ آئے تھے شکارنامہ ایلمانی میں شکاری پرندوں کے علاوہ شیر، چیتا، سیاہ گوش اور کتوں کے سدھانے اور پکڑنے کے طریقے علی بن منصور نے اضافہ کئے۔ قوانین الصیاد میں گھوڑے کی بیماریوں کا علاج، طوطا، مینا، بلبل، بیڑا، کتوں کے متعلق مفید باتیں پہلے بازناموں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔

عربوں نے غالباً یہ فن ایرانیوں سے سیکھا جس کی تائید نہ صرف عربی باز ناموں سے ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی کہ اس فن کی متعدد اصطلاحات عربی زبان نے فارسی سے مستعار لی ہیں۔ دو اصطلاحیں جو عربی باز ناموں میں بکثرت مستعمل ہیں یہاں مثال کے طور پر درج کی جاتی ہیں:- اول شورہین شاہین کی جمع۔ دوم گوشت مازہ (ہرغالہ کی پشت کا گوشت)۔ تعلیم یافتہ پنڈتوں کا بیان ہے کہ ویدوں میں بھی جن کا زمانہ تصنیف دو ہزار سے بارہ سو قبل مسیح ہے۔ بازداری کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اس کی تائید میں ایک لفظ ”سینا جیوی“ پیش کیا جاتا ہے۔ سینا جیوی اس شخص کو کہتے ہیں جس کا پیشہ اور ذریعہ معاش بازداری و باز فروشی ہو۔

بقول لفٹنٹ کرنل ڈی سی فلٹ جاپان اس فن کا گہوارہ تھا۔ گواب وہاں سے یہ فن قریب قریب مفقود ہو گیا ہو فری مین اور سالون بازداری کے سلسلہ میں یورپ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-

”انگلستان میں بازداری کے لئے سخت قوانین تھے جو ایڈورڈ سوم نے خاص طور پر وضع کئے تھے۔ یورپ میں اس فن سے آگ لگ رہی تھی۔ بادشاہ۔ امرا اور سپاہی مدہوشی کی حد تک اس کے دلدادہ تھے وہ ان مسرتوں کے حصول کے لئے اتنی کوشش کرتے تھے کہ جتنی اپنی ناموزی اور شہرت کے حصول کی خاطر۔ اگر کوئی سپاہی محبوس ہو جاتا تو وہ زنداں کی دیواروں پر بازوں ہی کی تصاویر کندہ کرتا رہتا۔ کلیسا میں جاتا تو باز اس کے ہاتھ پر ہوتے۔ اگر وہ قبر میں جاتا تو بازوں کی تصاویر ہی اسکی لوح مزار بنتیں۔ عورتیں نکاح کے دن مقام مناکحت پر اور نہیں تو مینا ضرور لے جاتیں۔ خاوندوں سے محو گفتگو ہوتیں تو اس فن کی اصطلاحات بطور استعارہ استعمال کرتی تھیں۔“

اب مشرق سے بھی جو ہمیشہ سے اس فن کا گھر رہا ہے، یہ فن مغرب کی طرح مفقود ہوتا جاتا ہے جاپان سے مفقود ہو گیا ہے، اور چین سے بھی معدوم ہو ہی چکا ہے۔ ہاں چینی بازار تیسرے بازاروں میں کبھی کبھی دیکھنے میں آ جاتے ہیں، جس سے اس کی چینی زندگی کا مدہم سا ثبوت مل جاتا ہے۔ یہ شوق ایران میں دم توڑ رہا ہے اور ہندوستان میں آخری سالس لیتا معلوم دیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل صوبہ سرحد۔ سندھ اور پنجاب میں بعض شوقین موجود تھے۔ مگر اب ان کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ ضلع اٹک میں جو اس شوق کے لئے شہرہ آفاق تھا۔ اس کے نام لیوا دو چار بزرگ باقی ہیں، ہوتی مردان میں بھی بازداری کا سامان پایا جاتا تھا، مگر اب نہیں ہے۔ اضلاع جھنگ۔ میانوالی۔ شاہ پور اور جھلم میں چند وضع دار رؤسا اس شغل میں مصروف ہیں مگر بدلی سے۔ چھ ہزارہ میں مرغابیوں کے شکار کے لئے ایک خاص قسم کا پرند ابھی تک پالا جاتا ہے مگر بہت کم۔ الغرض یہ آثار ظاہر کرتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد اس فن کا دنیا کے پردے سے محو ہو جانا ضروری ہے۔

بازداری کا اثر اردو زبان پر اگرچہ ہندوستان کے وسیع مرغزاروں کشادہ میدانوں اور شاداب جنگلوں میں پرندے بافراط ملتے ہیں اور صدیوں تک یہاں بازداری کا چرچا عام رہتا۔ حتیٰ کہ اسکولوں اور دیسی مکاتب کے طالب علم بھی شکرے اور لٹورے پالا کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہ چیز یہاں یورپ کی طرح

جذباتی نہ بن سکی اور اس نے زبان کو زیادہ متاثر نہ کیا، سودا کے سوا کسی اردو شاعر نے اس فن سے کوئی خاص اثر نہیں لیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ساری ترکی اصطلاحیں جو چغتائیوں اور مغلوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں رائج ہوئی تھیں اب تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔ سودا کی ہجو یہ مثنوی کے بعض اشعار جس میں اس فن کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، ملاحظہ ہوں :-

مثنوی درجو چنچ میرزا فیضو

آہ داویلا ز دست روزگار	توش خانوں میں یہ غم ہے رو بکار	بھوک سے جھنجھلا کے وہ غصہ میں آ	لے چلے مرزا ہی کو نیفے لگا
سر سے ہراک باز نے پٹکی کلاہ	رخت ہر شاہین نے پہنا سیاہ	اب پڑی ہے کوڑی اوپر منڈ منڈ	گرد چلتے پھرتے ہیں چڑیوں کے جھنڈ
ہو گئے جڑوں کے دل غم سے دو نیم	باشہ و شاہین و شکریہ بھی نیم	ہائے وہ مرزا کہ جس کا سن کے نام	آب ہو سیرغ کا زہرہ تمام
کیا ترمتی کیا کہی کیا بیدرا	یک بیک ان سے زمانہ یوں بھرا	سو کیا اس کو فلک نے یوں ذلیل	رتے ہی چنچ کے بگڑا ہے یہ نیل
صید اگر چاہیں کریں پردی کے تئیں	پنچوں میں اتنی بھی گیرائی نہیں	کودوں کی ٹھونگیں ہیں اور مرزا کا سر	سارو اڑ جاتی ہے منہ پر پند کر
دیکھ کر دیتے ہیں اب ٹڈوں کے خیل	تیرے کے ساتھ اب کانٹے ہیں دیل	اس کو مرزا گھر سے لے جاتے جدھر	نونڈی سے کہ جاتے ہانڈی چوٹے دھر
پشتہ کے آگے ترمتی ہے ضعیف	بھنگے کی نظروں میں دھوبی خفیف	گھر کی بی بی سے یہ کر جاتے قرار	کون بھڑوا کھائے کچھ غیر از شکار
میرزا فیضو کے چنچ مر گئے	توش ڈانے جگ کے ویراں کر گئے	اب دربیازی قوتی کھاتے میں سب	میرزا بوٹی کو تر سے ہے غضب
کس قدر ہے آسمان بے امتیاز	آہ کیا مارا ہے اُن نے شاہ باز	تھے چڑیا روں پہ مرزا جی کے گڑ	نصف انکے جتنے پکڑیں جانور
میرزا غمگیں ہوں چڑیاں شاد ہوں	گھونسلے چھیوں کے یوں آباد ہوں	ہائے جس دن سے وہ یار و مر گئے	سب چڑیا روں کے سر سے گر گئے
دیکھ سارو کو تو کیا خرسند ہے	ڈھڈھو کو اس سے خوشی دہ چند ہے	بلکہ وہ کہتے ہیں خاص و عام میں	میرزا آئے ہمارے دام میں
ہائے کیا تیرے گھر شادی ہے آج	پنیک و غوغائی کے گھر آیا ہے راج	لیں گے پیسے سابق اور اب حال کے	ورنہ پھنسا دیں گے جاکتوال کے
لبک کیا کیا مارتی ہے تہقہ	کیسے ڈھبر کر رہے ہیں چھپے	جب نکلتے گھر سے وہ بازار کو	تیز کرتے وال چھری کی دھار کو
حیف طعمہ ڈال کر وہ یوں مرے	اور ہراک جانور خوشیاں کرے	دیکھ کر ان کے تئیں بنے تمام،	بند کر آکھوں کو کہئے رام رام
کانپتی تھی خوف سے اس کے بٹیر	جیسے سبزک پر کیا تھا اس کو سیر	اُن سے یہ کہتے اگر منظور دھرم	ہے تمھیں۔ اور دھرم کی اپنے ہی شرم
کیا کہو تر۔ کیا ٹیڑھی کیا بڑے	قمری اور تیر توے اور ابلقے	تو چھڑاؤ پٹکیوں کے جانور	جتنے ہوں پیسے انھوں کے جمع کر
بگڑے اس کے خوف سے کرتے نہ تھے	سر کو پکھوں کے تلے دھرتے نہ تھے	بھج دو جلدی نہ ہو ایسا کہیں،	کھولوں میں بتوار سے چنچ کے تئیں
قارمک چلتے نہ تھے جھل کے کھیت	قرقرے چلتے کبھو یکن سو بیت	اس سخن کو جس گھڑی سنتے تھے وہ	وہیں کہتے تھے کہ جو چاہو سو لو،
دندغے کا کیا کلنگوں کا ہے ذکر	زندگی کا اپنی تھا سارس کو فکر	یہ تو بنے کیا ہیں کئی اک روز میں	راچو تانہ سے آئیں رشوتیں،
ایک دن مرزا گئے کرنے کو سیر	ہو گئی اس میں ٹمک اک طعمہ کو دیر	جیسے مرزا ہو گیا اس کا یقین،	ایک خر مہرہ کوئی دیتا نہیں،

ہائے ایسا غم نہیں اب تک ہوا میرزا جی کا دلی نعمت مولا مجھ کو بچپن سے رہا شوق شکار
گھر ہوا مرزا کا سب ماتم سرا پُر سے کو آئے ہیں یار و آشنا خوب سا اُن کا کیا ہے میں نے دیر
کر گریباں چاک یاروں کے حضور یوں بیاں کرتے ہیں اپنا منہ بسور پر نہیں دیکھا میں ایسا جانور
ہائے تھے چنچ جو وہ تو آپ تھے اپنے تو یار وہ مائی باپ تھے تھے غرض ہر جانور پر کیا وہ خیر
کھولے تھا اس کو میں جب پٹوار سے ہاتھ پر آتے تھے وہ اس ناز سے کیا ہوں چنچ تھے یا بائیں تھے
برگ گل جس طرح جھڑک باؤ سے پنکھ پر بلبل کے آوے چاؤ سے سنتے ہیں یہ درد جس دم آشنا
بھینکتا جب صید پر میں اس کو جا اس طرح جالگتے کا فرادا واقعی یہ غم تو ہے گانا گوار
جس طرح معشوق بے غصے کی نگاہ خون عاشق کا کرے ہے بے گناہ غم میں اس کے میرزا ہرگز نہ رو
پودنے نے یاں کے نگار میں جا ایک مینا سے کہا یہ ماجرا گو پھنسا تھا دام میں آ کر ہما
پودنے سے سنتے ہی اس بات کے اڑ گئے مینا کے طوطے ہاتھ کے غم کو اپنے دل سے اب موقوف کر
علامہ اقبال مرحوم نے اپنی ملی و فلسفیانہ اردو فارسی نظموں میں جُبرہ۔ شاہین۔ شاہباز۔ کلاں گیر۔ چنگال کا فوری
وغیرہ کا نہایت کثرت سے استعمال کیا ہے۔

شکاری پرندوں کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ گلاں چشم و سیاہ چشم۔ باز۔ باشہ اور شکرہ، گلاں چشم
شکاری پرندے کہلاتے ہیں اور بھری۔ چرخ۔ طغرل۔ شاہین۔ شفقار۔ زنج۔ لکڑ۔ ترمتی۔ سنگ منگ۔
خناقہ اور عقاب وغیرہ سیاہ چشم۔

گلاں چشم پرندو فادار ہوتے ہیں ایک دفعہ سدھ جانے کے بعد بہت کم بھاگتے ہیں۔ آدمیوں سے اس طرح
گھل مل جاتے ہیں کہ پھر جانے کا نام نہیں لیتے۔ اس وفاداری کے طفیل سیاہ چشموں کے مقابلہ میں بھاری قیمت
پاتے اور عزیز سمجھے جاتے ہیں۔ باز ان سب کا بلکہ تمام شکاری پرندوں کا سرتاج گنا جاتا ہے۔

نر باز مادہ سے جُستہ میں چھوٹا ہوتا ہے اور جُبرہ کہلاتا ہے جرات اور دلیری میں بھی یہ مادہ سے کم ہوتا ہے۔ پشا اور
لے "کلاں گیر" بڑے پرندوں کا شکار کرنے والا۔ لے کا فوری۔ چٹا باز۔ لے ترمتی مٹھ اور ترمنا ذکر ہے۔ اردو میں ترمتی زیادہ استعمال ہوتا ہے
اور ترمنا کم۔ باز اگرچہ مٹھ ہے مگر مذکر مستعمل ہے۔ لے لفظ جُبرہ صرف نر باز کے لئے مستعمل ہوتا ہے دوسرے پرندوں کے لئے اس کا استعمال
ناجائز ہے، مثلاً جُبرہ شاہین۔ جُبرہ چرخ وغیرہ نہیں کہتے۔ مگر علامہ اقبال صاحب کے کلام سے اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے مثال کے طور پر لے

جرہ شاہین بمرغان سرا صحبت مگیر خیز و بال دیر کشا پرداز تو کوتاہ نیست

ممکن ہے ان کے پاس اس کی کوئی سند موجود ہو۔ مگر باز ناموں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اُن کتابوں میں جُبرہ صرف نر باز کے لئے مستعمل
ہے بلکہ باقی شکاری پرندوں میں نر و مادہ کی تخصیص کرتے ہی نہیں۔ !

کی جانب سے آنے والے جرے آج سے پندرہ بیس سال قبل سوار ڈیڑھ سو کے درمیان قیمت پاستے تھے مگر اب انکی قیمت ستر سے لیکر ایک سو روپیہ تک ہے۔ میر شکاروں کی رائے میں ایک جرہ کا ان اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے۔ سر بڑا۔ اعضا چھوٹے مگر موٹے۔ چونچ بڑی۔ گردن قوی۔ کانوں کے سوراخ کشادہ۔ ترش رو۔ اندک خور۔ سخت کوش۔ فراخ حوصلہ۔ فراخ چشم ایسا جرہ بہت جری ہوتا ہے

مادہ باز۔ عرف عام میں لفظ باز کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے۔ اسی کوشکاری پرندوں کا سردار کہا جاتا ہے اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے پرند کے علاوہ خرگوش وغیرہ کا شکار آسانی سے کر سکتا ہے۔ ایک عمدہ باز کی پہچان یہ ہے۔ روپہلارنگ نرم گوشت۔ بھرا ہوا جثہ۔ خوش رنگ۔ گردن لمبی۔ سر چھوٹا۔ کندھے چوڑے چکے۔ دونوں ٹانگوں کی درمیانی جگہ کافی کشادہ۔ رانیں گوشت سے بھری اور خوب گتھی ہوئی۔ بعض ماہرین کی رائے ہے کہ اگر عمدہ باز کو دھوپ میں بٹھائیں تو وہ سورج کی طرف پشت کر لیتا ہے۔ بازداروں نے رنگوں کے لحاظ سے بھی ان کی اچھی بری قسمیں کر دی ہیں۔ مثلاً (۱) زرد رنگ باز۔ یہ دورنگی باز اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ عمدہ باز ہمیشہ یک رنگ ہوگا۔ صرف وہی دورنگ باز اچھا ہوگا جسکا عام رنگ زرد اور پشت سیاہ ہو۔ یہ بہت کمیاب ہے۔

(۲) آہو پے باز جس کی دم کے پروں پر ہرن کے پاؤں کی طرح کالے کالے پریوں (عام بازوں کے جن کی دم کے پروں پر کے خط چوڑے ہوتے ہیں) یہ بھی بہت کمیاب ہے۔ (۳) سبز پشت باز۔ (۴) سرخ باز۔ یہ سبز باز سے بہتر ہوتا ہے۔ چوباز جس کی دونوں رانوں پر چوڑائی کے بل ایسے خط ہوں۔ گویا ابھی ابھی گریز کر چکا ہے۔ نادر اور کمیاب ہے اسے خطنک بھی کہتے ہیں۔ (۵) کالا باز۔ (۶) سفید رنگ۔ (۷) شاہ باز، ماوراء النہر میں اسے لازنی کہتے ہیں۔ کہیں ہزاروں سال کے بعد کسی کے ہاتھ آئے تو آئے۔ بعض میر شکاروں اور ماہران فن کا خیال ہے کہ شاہ باز کا رنگ مخصوص نہیں، یہ بھی دوسرے رنگ کا ہوتا ہے۔ مگر قد میں سب سے بڑا اور قوت میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر اس کو پکڑ لیں اور سدھانے میں بازدار اپنی ساری مہارت ختم کر دے جب بھی یہ نام نہیں ہوتا اس کے سر پر پروں کا خوبصورت تاج ہوتا ہے۔

باشہ۔ یہ چھوٹا سا پرند ہے، عام لوگ پالتے ہیں۔ جرہ اس سے کوئی چار گنا بڑا ہوتا ہے۔ چھوٹے پرندوں کا شکار کھیلنے کے لئے عجیب چیز ہے۔ ایک عمدہ باشہ میں یہ خوبیاں دکھی جاتی ہیں۔ سر چھوٹا۔ پیٹ لمبا۔ منہ لمبوتر۔ گردن دلاڑ پنچے خوب مڑے ہوئے۔ انگلیاں چھوٹی چھوٹی۔ تلواتنگ۔ پنڈلیاں لمبی۔ سینہ فراخ۔ کندھے چوڑے اور گوی کے پاس سے ابھرے ہوئے۔ زبان کافی اور دم چھوٹی۔ بالکل یہ زمین کے متوازی اڑتا ہے اور اڑتے وقت دم باقی پروں سے الٹی ہوئی ہوتی ہے پانی کے اوپر پرواز کرنے کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ غسل کا شوقین ہے۔

شکرہ۔ ایران میں اسے پیغو کہا جاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت پرندہ باشہ کے لگ بھگ یا اس سے کسی قدر چھوٹا

مگر اس کے برابر دلیر اور وفادار نہیں ہوتا۔ اس میں بھی ہاشمہ کی ایسی صفات پائی جانی ضروری ہے۔

سیاہ چشم۔ ان پرندوں میں وحشت زیادہ ہوتی ہے۔ باز ہاشمہ کے سیکڑ جانے کے بعد ٹوئیاں نہیں پہنائی جاتیں مگر ان کے سر پر ہر وقت ٹوئیاں چڑھی رہتی ہیں۔ شکار پر اڑاتے ہیں تو ٹوئی سر سے اتار لیتے ہیں، بعد از فراغت پھر ٹوپی پہنا دی جاتی ہے۔ یہ بھی بہت دلیر ہوتے ہیں۔ باز دارانگی و فاک کے باب میں ہمیشہ بظن رہتے ہیں۔ اس گروہ میں سے شاہین بحری اور چرخ زیادہ مشہور ہیں۔ شاہین۔ اس کی وجہ تسمیہ بہادر می اور تیز پروازی سے متعلق چند دلچسپ قصے مشہور ہیں، قوانین الصیاد کے مولف لکھتے ہیں: جمشید کے سامنے شکار می پرندوں کو پیش کیا جا رہا تھا اور وہ ہر ایک کا مناسب نام رکھ رہا تھا۔ شاہین کو دیکھتے ہی اس کی زبان سے نکلا کہ ”شاہ ابن است“

شاہین صحیح معنوں میں شکاری پرندوں کا سردار ہے۔ ہر وہ چیز جسے بحری۔ چرخ۔ باز اور شندھار پکڑ سکتے ہیں۔ شاہین بھی اسے آسانی شکار کر سکتا ہے۔ میر شکاروں نے اس کی بہت تعریف لکھی ہے۔ اقسام شاہین:۔ اول چھوٹا جو بلند نہیں اڑتا۔ اکثر چھوٹے پرندوں کا شکار کرتا ہے۔ اس کا رنگ عموماً سرخ ہوتا ہے اسے اصطلاح میں ”آل“ کہتے ہیں، دوسری قسم سیاہ اور تیسری ابلق۔

کالے شاہین کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک زرد سر والا۔ دوسرا سر سے دم تک سیاہ، اس میں کسی دوسرے رنگ کی مطلق آمیزش نہیں ہوتی۔ ابلق بھی دو طرح کا ہوتا ہے ایک سفیدی مائل۔ جس کے ابروؤں پر سفیدی ہوتی ہے دوسرے خش (یعنی سفید و سرخ کی آمیزش) کالا شاہین ہندوستان میں کوکلا کہلاتا ہے۔ اس کا اصطلاحی نام افقاز ہے، یعنی یہ افقاز سے آتا ہے، اگر کسی دوسرے مقام سے بھی ایسا شاہین پکڑا جائے تو وہ بھی افقاز ہی کہلاتا ہے۔ خش زیادہ تیز پرواز اور بحری ہوتا ہے۔ کالا شاہین مندرجہ ذیل اوصاف سے متصف ہونا چاہیے۔

سر سے دم تک سیاہ۔ سینہ کالا۔ جثہ بزرگ۔ آنکھیں فراخ۔ اندر دھنسی ہوئی۔ منہ کالا۔ دونوں کانوں کی درمیانی جگہ فراخ۔ دم کے پر چھوٹے اور اٹھے ہوئے۔ پنڈلی موٹی۔ رانیں گول۔ ناخن بڑے انگلیاں لانی زبان کالی۔ سان کی جڑ پر دو کالے خط طعمہ کھاتے وقت غضبناک ہو جانے والا۔ حریف شکار۔ گرسنگی سے بے تاب ہو جاتا ہوا اڑتے ہی فوراً بلند ہو جائے۔ اگر بلائیں تو گولی کی طرح آگے۔ بعض اوقات اس زور سے حملہ کرتا ہے کہ چھاتی زمین پر لگ کر چلنا چور ہو جاتی ہے۔

پہاڑی شاہین، جسے ہندوستانی بحری کہتے ہیں۔ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک کوہی دوسرا بحری۔ بحری ان جزیروں میں انڈس بچے دیتی ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہوں۔ ابھی تک کسی شخص نے اس کا گھونسل نہیں دیکھا۔

کوہی جو پہاڑوں پر رہتا اور انڈس بچے دیتا ہے، اس کا آشیانہ عام شکاریوں نے دیکھا ہے۔ بحری بہت غصہ ناک ہوتی ہے۔ جب یہ جزیرہ سے نکل کر سمندر کے پانی پر محور پرواز ہو اور نظر اتفاقاً اپنے عکس پر پڑ جائے تو

اسے اپنا حریف سمجھ کر حملہ کرتی ہے اور اپنی جان کو سمندر کی لہروں کی نذر کر دیتی ہے۔ دراصل یہ شاہین ہی کی ایک قسم ہے۔ یہ کوئی عجاظہ چیز نہیں۔

چرخ - جرہ - بحرئی - شاہین اور چرخ میں بہ لحاظ قد و قامت تھوڑا تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ پرند چونکہ سستا ہوتا ہے اور اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس روپیہ ہوتی ہے، نیز دلاور بھی ہوتا ہے اس لئے بکثرت پالا جاتا ہے ایرانی بحرئی اور شاہین کو زیادہ پسند کرتے ہیں، مگر پنجاب میں یہ زیادہ ہر دلعزیز ہے۔

ایرانیوں کی طباعی اور ذہانت تو مشہور ہے۔ اس فن میں بھی ان کی اولیات اور اختراعات معجزہ سے کم نہ تھیں وہ چرخوں سے بہرہ پکڑ دیا کرتے تھے۔ سیاہ چشموں کے شکار میں جو لطف ہوتا ہے وہ گلال چشموں کے شکار میں نہیں ہوتا۔ گلال چشم جاتے ہی صید کو دبوچ لیتے ہیں۔ مگر یہ چھپٹے مار مار کر صید کے پرزے اڑاتے جاتے اور ساتھ ساتھ اڑتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے خرگوش کے شکار میں دیکھا ہے کہ اوپر فضا میں یہ منڈلا رہے ہیں۔ بازدار نیچے سے خرگوش کو نکالتے ہیں۔ خرگوش وحشت زدہ خرگوش پورے زور سے دوڑتا ہے یہ اس کو دیکھتے ہی پل پڑتے ہیں۔ ایک جھپٹا مارتا ہوا اور غریب جانور کی کھال ادھیرتا دوسری سمت نکل جاتا ہے۔ اتنے میں دوسرا حملہ کر کے خرگوش کا تیا پانچا کتا مقابل کی سمت کو نکل جاتا ہے اس پھرتی اور عجلت سے باری باری حملہ کرتے ہیں۔ کہ بھاگتا تو درکنار خرگوش کا اپنے مرضی سے دو قدم چلنا بھی دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ جنگل کے اندر حملوں کے صد مات سے یا تو خرگوش کا ادھمرا جسم ہلا ارادہ لڑھکتا اور جگہ بدلتا نظر آتا ہے۔ یا غریب حیوان کی جگر خراش چنچیں پچی ہوئی کھال کے پرزے اور خون کے چھینٹے ہر چاروں اڑتے دکھائی پڑتے ہیں۔ شکاری ارد گرد کھڑے اپنی ہنرمندی پر دل ہی دل میں پھولے نہیں سماتے۔

ماہرین نے عام طور پر اس کی تین قسمیں کی ہیں۔ اور رنگ کے لحاظ سے سفید - سرخ - زرد اور خاکستری۔ اس کے سوا چرخ کا اور کوئی رنگ نہیں۔ رنگ کے اعتبار سے عمدہ چرخ وہ ہوتا ہے جس کا سر سفید اور پیٹھ پر سفید سفید نقطے ہوں۔ دم نسبتاً زیادہ سفید دکھائی دے اسے لگاریں کہتے ہیں۔

سفید سر والا ایک اور چرخ ہوتا ہے جس کی دم اور سر دوسرے چرخوں کی نسبت زیادہ چمٹے ہوتے ہیں، اس کو مروارید دم اور سپید نگاری بھی کہا جاتا ہے۔

بازنامہ ایران کا مصنف علی بن منصور لکھتا ہے کہ ایک دفعہ مجھے خواجہ علی نیشاپوری نے قلیقور یا سوس چتائی کے پاس بھیجا تھا۔ میں نے وہاں ایک چرخ دیکھا تھا جو ”طیغوباز“ سے بھی زیادہ چٹا تھا اس کے پر غزہ دم کے سب چھوٹے بڑے پر نہایت سیاہ تھے۔ یہ چرخ مملکت تیموریہ سے بھی زیادہ قیمتی ہوگا۔ دراصل یہی ”نگاریں“ تھا۔

عمدہ چرخ وہ ہے جو جسم ہو۔ جثہ گوشت سے بھرا ہوا ہو زشت رو۔ انگلیاں طویل۔ پنجے قوی اور مضبوط۔

بازنامہ ایران یا شکارنامہ الخانی ایک ہی ہیں۔

لوے چوڑے ناخن سیاہ - پنڈلیاں چھوٹی اور موٹی - دم مرواریدی - سینہ فراخ - سر بڑا - منقار نہایت سخت اور مضبوط
لٹے کی طرح بیٹھے - جلد جلد کھائے اور بھوک میں بے تاب ہو جائے۔

منقار - یہ قدر قامت اور جثہ کے لحاظ سے عقاب سے بھی بڑا ہوتا ہے اس کے چار رنگ مشہور ہیں، سفید
بس میں کسی دوسرے رنگ کی مطلق آمیزش نہ ہو۔ ناخن اور منقار بھی دودھ کی طرح سفید ہوں۔ اسے طینگو کہتے ہیں۔
دوسرا ایسا سفید جس کے ہر چھوٹے بڑے پر کے اوپر سیاہ نقاط ہوں۔ اس کی چونچ اور پنجے بھی سفید ہوتے ہیں اسکو
نگاریں کہا جاتا ہے اور بڑی نادر چیز شمار ہوتی ہے۔

ایک اور قسم ہوتی ہے جو ”چوزگی“ میں شاہین اور چرغ کے مانند - گزر دی کے لحاظ سے ان سے زیادہ زرد
کرز کے بعد شاہین کی طرح کبود رنگ ہو جاتا ہے۔ یہ قسم تمام قسم کے شتقاروں سے زیادہ سخت کوش ہوتی ہے۔ کالا
شتقار بھی ہوتا ہے۔ شتقار جتنا بزرگ جثہ ہوگا اتنی ہی اچھا کام دے گا۔ کہتے ہیں یہ جب بھوکا ہو تو اپنا گوشت نوچ نوچ
کر کھانے لگ جاتا ہے

سنگ سنگ - شتقار کی قسم کا جانور ہے۔ روم کی طرف سے لاتے اور شتقار قرابہ بولتے ہیں۔

خناقہ - چرغ کی قسم کا جانور ہے۔ مگر جسم میں چرغ سے قدرے چھوٹا۔ اسے اٹک میں ”چرگیلا“ کہتے ہیں، اعمال کے
لحاظ سے شاہین اور چرغ کے بین بین ہوتا ہے۔ جن چیزوں کا وہ شکار کرتے ہیں ان میں بعض کو یہ بھی پکڑ لیتا ہے
بعض نہیں پکڑ سکتا۔ اس کے ذاتی اوصاف کا چرغ پر قیاس کر لیجئے۔

لکڑ - بہت عام پرندہ ہے۔ ہمارے دیہات پر اس کی خاص نظر عنایت ہے، مرغ اور بیڑ کا خاص دشمن ہے۔ بلندی
سے توپ کے گولے کی طرح پرندوں پر گرتا ہے۔

طغرل - ایک پرندہ ہے باز اور شتقار کے بین بین۔ سر اور پاؤں باز کی طرح جسم اور پر شتقار کے ایسے۔ یہ دو رنگ کا
ہوتا ہے اول کالا۔ جس کے پاؤں بغایت زرد ہوتے ہیں۔ گویا کسی نے سونے کا جھول چڑھا دیا ہے۔ دوسرے کی
منقار اور آنکھیں مرغ کی طرح سُرخ۔ بعض کے پاؤں اور چونچ کا رنگ ہاتھی دانت کا ایسا ہوتا ہے۔ ناخن درشت
اور سیاہ ہوتے ہیں۔

یہ پرندہ خطا کی طرف سے آتا ہے۔ ابوالخیر سی لکھتا ہے کہ خوارزم شاہ نے خیواسے ۴۹۱ھ میں امیر اسمعیل
بن احمد کے لئے شکاری پرند بھیجے تھے ان میں ایک اعلیٰ طغرل بھی تھا۔ کالا رنگ۔ منقار بغایت زرد۔ آنکھیں لال
انگاردہ سی۔

علی بن منصور نے ایک طغرل دیکھا تھا جسے دریائے ماژندران کے کنارے گرفتار کیا گیا تھا۔ کوئی پہچان نہ سکا۔
مگر باز نامہ سے معلوم ہوا کہ طغرل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ طغرل نایاب اور نادر الوجود پرندہ ہے۔

شکاری پرندوں کے سدھانے اور شکار کے لئے طیار کرنے کے طریقے بہت دلچسپ ہیں۔ ایرانی بازداروں کے طریقوں اور ہندوستانی میزکاروں کی طرز و روش میں فرق ہے۔

بازوں کی آمد اور گرفتاری کا زمانہ باز ماہ آذر کے نصفِ آخر میں پشیمان اور ترکستان سے جہاں ہمیشہ برف پڑتی رہتی ہے آتے ہیں۔ پھر جب سردیاں شروع ہوتی ہیں تو یہ جاڑے کے خون سے انگست میں وہاں سے بھاگ کر گرم ممالک کی طرف چلے جاتے ہیں۔ مرغابیاں پہلے نقل مکانی کرتی ہیں اور بازان کے بعد جب سرد و خراسان میں پہونچتے ہیں تو وہاں رہ پڑتے ہیں کیونکہ کوہِ فرادہ - عمران - مازندران - کنروداو - سمرقند کی دلدلیوں میں اور انازان و زارمرو کے نواحی علاقہ میں چکورا اور خرگوش وغیرہ باغیراط ملتے ہیں۔ ابتداً قہر میں صیاد وہاں انھیں پکڑ لیتے ہیں۔

ہندوستان میں جہاں پانی کے بڑے بڑے تالاب ہوں۔ مرغابیوں کی بہتات ہو۔ درختوں کے جھنڈ ان قطعاتِ آب کے گرد اگر دو دو تک پھیلے ہوئے ہوں۔ ایسے گھنے جنگلوں میں باز رہ پڑتے ہیں اور ہندوستانی چڑیاکار وہاں سے بازوں کو پھانسی لاساتے ہیں۔

جب باز جال کے اندر پھنس جاتا ہے تو صیاد ایک چادر کی اوٹ میں جا کر فوراً باز کی آنکھیں سی دیتا اور پاؤں میں ”بن“ ڈال دیتا ہے۔ اوٹ میں جانے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ جانور انسان کو دیکھنے نہ پاسے۔ چونکہ یہ بہت ہی زیرک اور دانا پرندہ ہے اگر ابتداً اسیری میں اس کی نظر انسان پر پڑ گئی تو وہ اس دشمن کو کبھی نہیں بھول سکتا۔

باز کے سدھانے کا ایرانی طریق جب چشمِ دوختہ باز کسی بازدار کے ہاتھ آتا ہے تو رات کے پہلے حصہ میں چراغ کے سامنے لے جا کر آنکھوں کے دورے کسی قدر ڈھیلے کر کے نہایت ملاحظت و نرمی سے اس کے سینہ پر ہاتھ پھیرتے اور مہربانی کا اظہار کرتے جاتے ہیں۔ تین دن سے زیادہ آنکھیں بند کرنا جائز نہیں جب آنکھیں کھولنی ہوتی ہیں تو رات کے پہلے پہر میں قدرے کھول دیتے ہیں۔ اڑھائی پہرات گزر جانے تک بیدار رکھتے ہیں۔ اس کے بعد آرام کے لئے پتوار پر باندھ دیتے ہیں۔ چوتھے دن رات کو ساری آنکھ کھول دیجاتی ہے اس آئنا میں باز کا چہرہ کنگھیوں سے ہی دیکھتے ہیں، سامنے سے نہیں دیکھتے، اس سے باز کے دل میں بازدار کی طرف سے خوف و ہراس پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پہلے پہل جب آنکھ بہت تھوڑی کھولتے ہیں تو بہت چکار بچکار کر باہر بھاگتے اور کسی نہ کسی طرح گوشت کا ایک پارچہ اس کے پنجوں میں پکڑا دیتے ہیں تاکہ وہ سیر ہو جائے۔ پہلے دن تین گھنٹے تک باز کو جگاتے اور ہاتھ پر بٹھاتے ہیں، دوسری رات آدھی تک۔ اور تیسری رات تمام شب۔ اس کے بعد ”پتورا“ پر باندھ دیتے ہیں کہ پروں کو چھپھا کر درست کر لے اور قدرے آرام پاسکے۔

پوچھتے پھر باز کے پاس جاتے ہیں، مگر اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کھڑے کھڑے باز کے سامنے نہیں

جاتے خواہ تاریکی ہی کیوں نہ ہو۔ بیٹھے بیٹھے اور اپنے آپ سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے جاتے ہیں اور بازی طوت پشت کر کے بیٹھ جاتے ہیں، پھر نہایت احتیاط سے پتوار سے ہاتھ پر اٹھا لیتے ہیں، لیکن اس بات کا خاص لحاظ رکھتے ہیں کہ باز پھڑکنے پائے نہ کوئی آدمی باز کے پیچھے اور پہلو سے گزرے۔ دس بجے دن تک ہاتھ پر بٹھائے رکھتے ہیں۔ اس میں بھی خاص اُستادی برتی جاتی ہے، بوقت چاشت ”گوشت پشت مازہ“ کا طعمہ کسی نہ کسی طرح خوب پریٹ بھر کر کھلا دیتے ہیں پھر ”پرداز“ پر بٹھا دیتے ہیں، ”پرداز“ تاریک کمرہ کے اندر بنایا کرتے ہیں، عصر کے بعد جب شام ہونے لگتی ہے۔ باز کو ”پرداز“ سے کھول کر ہاتھ پر اٹھا کر گزر گاہ عام پر جا بیٹھتے ہیں۔

جب تک پرند پتوار پاؤں پر رہتا ہے، پانی کا برتن اس کے سامنے دھرا رہتا ہے، جب بھی ہاتھ پر اٹھاتے ہیں، اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ باز پتوار سے ہاتھ پر آئے۔ اگر اس نے پرداز کی لکڑی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہو تو جب تک وہ خود بخود اپنے پنجے ڈھیلے نہ کر دے۔ زبردستی نہیں کرتے۔

جب باز گوشت بر غبت کھانا شروع کر دے تو آہستہ آہستہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر بلا تے ہیں، ابتداء میں دور سے باز کو گوشت دکھا کر بلانا غلطی ہے۔ پہلے ایک سے دوسرے ہاتھ پر بلا تے ہیں پھر زمین سے ہاتھ پر باز اور بازدار کے درمیان دس گز سے زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ جب اسکی عادت پڑ جاتی ہے تو پھر دور سے بلا تے ہیں بلانے کی آواز کافی بلند ہوتی ہے۔ اس بات کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے کہ باز، پرداز سے خود بخود ہاتھ پر آئے۔ یہ عادت پیدا کرنے کے لئے شروع شروع میں گوشت کا ٹکڑا ہاتھ میں لے جا کر باز کے پاس جاتے ہیں وہ گوشت کے لالچ میں ہاتھ پر آ بیٹھتا ہے بالآخر خالی ہاتھ سامنے کرتے ہی اڑ کر اُس پر آ جاتا ہے۔

ابتداءً دور سے بلانے کا یہ طریقہ ہے کہ باز کی ڈور کے سرے پر لوہے کا ایک حلقہ لگا دیتے ہیں، اس حلقہ سے سو گز کے قریب لمبی رسی گزار لی جاتی ہے، ایک شخص رسی کا سراپکڑ کر دور جا کھڑا ہوتا ہے اور ہاتھ میں زندہ پرند لے کر اس کو پھڑپھڑاتا اور باز کو بلاتا ہے۔ جب باز قریب پہنچتا ہے۔ رسی کو کسی قدر ڈھیلہ کر دیا جاتا ہے تاکہ باز پرند پر ٹھیک طور سے آگے۔ ورنہ اگر غلطی سرزد ہوگئی تو پھر وہ اس کے دل میں گھر کر لے گی۔ بلانے والے آدمی کا منہ باز کی سمت نہیں ہوتا بلکہ وہ آڑا کھڑا ہوتا ہے۔

جب باز بلانے سے فوراً آنے لگتا ہے اور پرندوں کے پکڑنے کی اسے عادت ہو جاتی ہے تو پھر یہ کرتے ہیں کہ جب وہ بلا تے وقت ہاتھ کے قریب پہنچتا ہے تو پرند کو زمین پر ڈال دیتے ہیں۔ جسے پکڑ کر وہ کھانے لگ جاتا ہے۔ بازدار باز کے گرد گھومتا اور بلند آواز سے بوتا رہتا ہے تاکہ وہ ان باتوں کا عادی ہو جائے۔ پھر وہ پرند کو چھین کر باز کو دور سے بلا تے اور خوب شکم سیر کر دیتے ہیں۔ اس عمل کے دوران میں اسے بازاروں اور شور و غل والے مقامات پر لیجا کر گھومتے پھرتے ہیں۔ جب باز ڈور سے چھوٹ کر آزادانہ طور سے آنا شروع کر دیتا ہے تو اس کے بعد درختوں وغیرہ

پر پھینک کر باز کو بلاتے ہیں اور چنچے والے پرند اس کے پنجوں میں دے کر کھلاتے ہیں۔ اب ”باولی“ کا نمبر آتا ہے۔ پہلے دن ایک کبوتر لے کر اس کے بازوں کے چند پر اکھیر ڈالتے ہیں اور یہ ”دکم پر“ کبوتر چھوڑتے اور پیچھے سے باز کو اڑاتے ہیں۔ جب وہ اس پرند کو پکڑے تو اسے آزادانہ طور سے کھانے دیا جاتا ہے۔ اس دن باز کو ہاتھ سے کبوتر پر پھینکتے ہیں۔

دوسرے دن باز کسی درخت یا مکان کی چھت پر بٹھا کر اُسی قسم کا کبوتر اڑاتے اور باز سے پکڑواتے ہیں۔ اگلے دن کسی کھلے میدان میں لے جا کر ”باولی“ دیتے ہیں۔

جب باز، مرغ اور کبوتر کی باولی سے خوب مانوس ہو جاتا ہے تو تیسرے چکور۔ مرغابی وغیرہ کی باولی حسب ضرورت دے کر اپنا کام شروع کرتے ہیں۔

شروع شروع میں ایرانی یوں کرتے ہیں کہ جس پرند پر باز کو اڑانا ہو ابتداءً شکار میں بار بار اڑا کر خوب تھکاتے ہیں اور اس کے بعد باز اس پر پھینکتے ہیں۔ پہلے دن ایک دوسرے دن دو تیسرے دن تین علی ہذا دسویں دن دس پرندوں پر اڑاتے ہیں۔ اب باز ہر طرح شکار کے لئے طیار سمجھا جاتا ہے۔

بے شمار ایسی ادویہ ہیں جو گرسنگی اور حرص شکار پیدا کرنے کے لئے ”ایام شکار“ میں باز کو کھلائی جاتی ہے۔ ایرانیوں کا خیال ہے کہ نیا باز زیادہ سے زیادہ دو سال یا ایک سال کی مدت میں تیار کرنا چاہئے اور جرہ و شاہین چالیس دنوں میں۔ بیس دن سے کم مدت کسی طرح جائز نہیں۔

غالباً یہ مضمون ناتمام رہے گا اگر اس فن کی چند اصطلاحوں کا ذکر نہ کیا جائے۔

تعلیقات بازداری

اڈا۔ اسے چکس کہتے ہیں۔ شکاری پرند اس پر بٹھائے جاتے ہیں۔ بازدار۔ اسے ترکی میں قوشچی کہتے ہیں یہ وہ شخص ہے جو باز کو شکار کے لئے تیار کرتا ہے۔ میر شکار اس سے الگ اور بلند حیثیت کا شخص ہے۔ اسے بازداروں کا سردار سمجھ لیجئے۔ کبھی کبھی دونوں حیثیتوں کا مالک ایک ہی شخص ہوتا ہے۔ بند۔ یہ پرندوں کی ٹانگوں میں ڈالا جاتا ہے۔ اس کے اندر بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے ٹانگیں حرکت کرتی رہتی ہیں۔ بند وزن میں کافی ہلکے ہوتے ہیں اور لمبے بھی پانچ چھ انچ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ تاکہ پرواز میں حائل نہ ہوں۔ یہ ہمیشہ پرندوں کی ٹانگ میں بندھے رہتے ہیں۔

ان دونوں ”بندوں“ کا ایک ایک سر تو ٹانگوں کے گرد لپٹا ہوا باندھ دیتے ہیں دوسرے سرے پر لوہے کے گلت شدہ خوبصورت حلقے ہوتے ہیں۔ ان دونوں حلقوں سے ”شکار بند“ (بالشت بھرلمبی رسی) گزارتے ہیں جو دوسری طرف لوہے کے اس شکل ۹ کے چھلے سے بندھا ہوتا ہے۔ جس کے نچلے حصے سے ڈور گزار دی جاتی ہے۔ بند اول اول چمڑے کے ہوتے ہیں۔ جب پرندہ کی وحشت دور ہو جائے تو پھر ریشم اور طلا سے تیار کئے جاتے ہیں۔

باولی - وہ پرندہ یا جانور جو شکاری پرندوں کو سدھانے اور حریریں شکار بنانے کی خاطر استعمال کرتے ہیں۔
 پتوار یا پدوار - دو لکڑیاں عموداً گاڑ کر تیسری لکڑی افقی صورت میں ان کے اوپر رکھتے ہیں (اس طرح II)
 پرندوں کے آرام کے لئے کام آتی ہے۔ ہندوستان میں کافی بلند بناتے ہیں۔ مگر عرب میں زیادہ اونچی
 نہیں بناتے۔ ”اڈا“ مکانوں کے گوشوں میں ایک لکڑی سے بناتے ہیں اور پدوار یا پتوار ہر جگہ کام آتی ہے
 پر مہرہ - پر سے مراد چند مخصوص ادویہ کا پروں میں لپیٹ کر شام کے وقت جانور کو کھلانا اور اس بات کا خیال
 رکھنا کہ وہ صبح کس وقت ان پروں کو اُگل دیتا ہے۔ مہرہ - مرغ کی گردن کی ہڈیاں کھلانا۔
 چونکہ پر و مہرہ کا ایک ہی وقت دینا جانوروں کی صحت کے لئے مفید ہوتا ہے اس لئے دونوں کو ملا کر
 پر مہرہ کہتے ہیں، پنجاب میں پر اُگلنے کے لئے ”سر چھینڈنا“ مستعمل ہے۔ میری نظر سے کوئی لفظ اردو - فارسی کا
 نہیں گزرا جو اس مطلب کو واضح کرتا ہو۔

تکمرہ - طعمہ کی ایک قسم۔

تلی - تلوے خراب ہونا۔ جس سے پنجوں کی قوت گہرائی بالکل زائل ہو جاتی ہے اور جانور نہ کارہ ہو جاتا ہو۔
 ٹوپی - فارسی کلاہ۔ گلال چشموں کو صرف ابتدا میں جب سدھائے جا رہے ہوں پہناتے ہیں۔ بعد میں نہیں۔
 مگر سیاہ چشموں کے سر پر ہمیشہ چڑھی رہتی ہے۔

چغولی - وہ خوبصورت ڈورا جو گردن میں ڈالتے ہیں۔ اس کی لمبائی پرندہ کی گردن سے لے کر پنجوں تک ہوتی
 ہے اسے چلغوا اور چلغوبھی کہتے ہیں۔

دستانہ - اہل ایران اسے دست خاص اور ”ہلمہ“ کہتے ہیں، ہاتھ کو پرندوں کے ناخنوں سے محفوظ رکھنے
 کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

دلہ - ترکی میں قرال قو و قرالتغو کہتے ہیں۔ کوئے یا کبوتر کا ایک بازو پروں سمیت ایک لمبی رستی سے بندھا
 ہوتا ہے۔ رسی گھما گھما کر سیاہ چشموں کو اس پر بلاتے اور سدھاتے ہیں۔

ڈور - ایک خوبصورت سوتی یا ریشمی رستی جس کی لمبائی تین گز کے قریب ہوتی ہے۔ اس سے بازو وغیرہ
 پتوار پر باندھے جاتے ہیں۔

چوڑ - وہ پرند جس نے ابھی تک بچپن کے پر نہ گرائے ہوں۔

شکرہ - مشہور پرندہ کے علاوہ ایرانی تمام شکاری پرندوں کے لئے شکرہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

طعمہ - وہ گوشت جو بطور خوراک پرندوں کو کھلایا جاتا ہے۔

طعمہ آبدارہ - پانی میں ڈال کر طعمہ کھلانا تاکہ پانی بھی ساتھ ہی پی لیں۔

طعمہ داری - ایک خاص ترکیب سے طعمہ اور جلاب دینا۔
 قوش خانہ - وہ مکان جہاں پالتو شکاری پرند رکھے جائیں۔
 کمریز - بچپن کے پروں کو گرا کر ان کی جگہ نئے پر نکالنا۔
 گدڑی - اسے فارسی میں "قباچہ" کہتے ہیں، تو گدڑی پرندوں کو جب بازاروں میں بھراتے ہیں تو اس خوف سے کہ
 مہاراجہ وحشت کھا کر کھڑکیں اور پتھر توڑ ڈالیں۔ "گدڑ" کی دو تھیلیاں ہر بازو پر چڑھا دیتے ہیں۔
 جس طرح لکھتے ہیں ایک قطعہ زمین - مبلغ دو روپیہ - تین زنجیر فیل، چار راس بیل - اسی طرح ان پرندوں
 سے پہلے بہتہ کا لفظ لکھا جاتا ہے۔
 کچھ اصطلاحات میرزا سودا کی نظم میں آگئی ہیں ان پر خط کھینچ دے گئے ہیں۔

فضل حسین تبسم

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علیحدہ علیحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں۔

نگارستان	جمالستان	ترغیبات حبشی	شہاب کی سرگزشت	انتفسار جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نور روپیہ
معرکہ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔
 منیجر نگار لکھنؤ

ساتھ سال کے بعد ہماری ادبیات

(پروفیسر فراق گورکھپوری کے ایک انگریزی مقالہ کا ترجمہ)

اگر مستقبل کی آنے والی صورتوں پر نظر رکھی جائے تو خیالات کی بہت سی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں۔ یہ کہنے کے لئے کہ ساتھ برس کی دنیا آج سے بالکل مختلف ہوگی، پیشین گوئی کی کسی غیر معمولی طاقت کی ضرورت نہیں۔ اسوقت ہندوستان آزاد۔ فارغ البال اور بخوبی منظم ہو چکا ہوگا۔ حکومت کا انتظام نہایت عمدہ ہوگا اور ثانوی تعلیم عام ہو چکی ہوگی ذاتی طور سے میرا خیال ہے کہ اسوقت ہمارا سماج اور حکومت اشتراکیت پسند ہوگی۔ ان باتوں کے تصور کے لئے اور آنے والی روشن و خوشگوار صبح کا خیر مقدم کرنے کے لئے کچھ ضروری نہیں کہ آپ ایک زبردست انقلابی ہی ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستانی زبانوں اور ہندوستانی ادب کا اسوقت کیا عالم ہوگا؟۔ وہ امور جو چالیس کروڑ انسانوں کو پیش آچکے ہوں گے اور وہ تمام واقعات جو ان کے سامنے رونما ہوں گے، زبان و ادب کو بھی وہی واقعات و امور پیش آئیں گے اور ان پر بھی ان کا اثر پڑے گا۔ آئیے ہم ان کے تصور کی کوشش کریں جب ملک کا ہر باشندہ آزاد۔ فارغ البال اور ترقی یافتہ ہو چکا ہوگا تو ہمارے ادبی مشغلے بے انتہا وسیع ہو جائیں گے اور ادبی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوگا۔ شخصی اور عام کتب خانے کتابیں اور اخبار و رسائل کئی ہزار گنا بڑھ جائیں گے اور یہ اندازہ محض خیال آرائی یا غلو پر مبنی نہیں کیونکہ چالینس کروڑ مشتاق پڑھنے والوں کا تصور کیجئے تو آپ کو خود اس امر کا یقین ہو جائے گا۔

یہ ادبی پیداوار اور مشغلے اردو۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ تامل۔ ٹیلیگو۔ کناری۔ ملایالم۔ اور غالباً ہندوستان کی دو ایک دوسری خاص زبانوں میں ہونگے اور زیادہ تر ہر زبان کی محیاری اور ترقی یافتہ شکل میں ظاہر ہونگے۔ زبان کے اس ارتقائی دور میں جبکہ رفتہ رفتہ معیار کا تعین ہو رہا ہوگا دو طرح کے اثرات پیدا ہو رہے ہوں گے۔ عوام کا دباؤ اور ان گنت انسانوں کا نیچے سے اوپر چہار جانب سے اثر اس قدر عادی ہو جائے گا کہ ہر ہندوستانی زبان کی فرہنگ میں ان کے الفاظ محاورات۔ فقرات اور بولی ٹھولی اور عام طرز گفتگو کا، جو اب تک محترم ادبی حدود سے خارج رہے ہیں، ایک سیلاب سا آجائے گا اور اسی کے

مقابلہ دماغی۔ علمی۔ جمالیاتی اور حسن کار طبعی اور شخصیتیں اس خارجی اور اندرونی سیلاب کے ساتھ آنے والے الفاظ و محاوروں کو ایسے سانچے میں ڈھالیں گی اور ایسی شکل و صورت حطا کر دیں گی جو ان کو ادبی قیمت و استقلال بخشنے کی ہر زبان کی ارتقا سماجی تبدیلیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ہر زبان کی تاریخ اس کے الفاظ میں وسعت قوت۔ جذب۔ ٹھیراؤ۔ اور روانی پیدا کرنے اور ان کے باہمی گھٹنے ملنے سے نئی شکلوں، نئے معنی۔ اور نئے مشتقات مرتب ہونے کی ایک داستان ہوا کرتی ہے۔ جس طرح معاشیات میں جمہوری نظام کی خصوصیت ہے کہ نئی صورتیں بنتی ہیں۔ پھر بگڑ جاتی ہیں اور ان کے اس بنناؤ بگاڑ کے باہمی اثر سے پھر نئی شکلیں وجود میں آتی ہیں۔ اسی طرح زبان بھی ایک "جدلی" اصول ارتقا کے ماتحت بڑھتی اور ترقی کرتی ہے۔ عوام کی زبان۔ ڈھیلی بے جوڑ۔ بے رنگ اور بھدی ہوا کرتی ہے اور ایسی زبان ادب نہیں ہوا کرتی اور نہ یہ تحریر کی زبان ہوتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ ادب خام اور زبان خام ہے۔ لیکن ایک تعین معیار کے دور سے گزرنے کے بعد زبان اپنے اعضاء، رگوں اور نسلوں میں ایک سختی سی محسوس کرنے لگتی ہے۔ الغرض گویا ہر زبان میں عوام سے "اثر پذیر" اور تعین معیار کا عمل برابر جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی خاص زبانوں میں نئی سادگیاں۔ نئی پیچیدگیاں۔ نئے تشبیہی اقسام اور نئے معنوی اختلافات۔ نئی آزادیاں اور نئی پابندیاں پیدا ہو جائیں گی۔

دو ہزار برس سے زیادہ ہوا کہ یہ ہندوستانی زبانیں عوام کی عام بولی کی حیثیت سے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں پھیل پھول رہی تھیں۔ ان میں نہ تو مستحضران آیا تھا اور نہ انھوں نے معیاری حیثیت حاصل کی تھی۔ ان میں سے ہر زبان کی بیسیوں مختلف قسمیں تھیں۔ ان زبانوں کا کوئی ادب نہ تھا۔ سارے ہندوستان میں ادب کی زبان صرف سنسکرت تھی۔ لیکن سنسکرت میں سختی پیدا ہو چکی تھی اور اب وہ ہندوستانی باشندوں کے کسی گروہ کی بھی بول چال کی زبان نہ رہی تھی۔ اس کے بعد سنسکرت میں دفعتاً تنزل پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور مہاتما بودھ کے عروج کے ساتھ پالی اور پراکرت ادب پیدا ہونا شروع ہوا۔ اسی سلسلہ میں اس موقع پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ پالی اور پراکرت "بولیوں" کا وجود مہاتما بودھ کا رہیں منت نہیں۔ یہ بولیاں سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل کی حیثیت سے پہلے ہی رائج تھیں۔ بودھ جی کی وجہ سے صرف زبانوں کا ادب پیدا ہوا۔ (یہ حیرت انگیز حقیقت ہے کہ یورپ میں بھی اسی طرح یورپ کی مختلف قوموں اور نسلوں میں جو لاطینی زبان سے نکلی ہوئی مقامی بولیاں رائج تھیں ان سے ایک رومانوی ادب پیدا ہونے لگا تھا) الغرض اس وقت کی خاص خاص ہندوستانی زبانوں کی پیدائش پراکرت، پالی اور سنسکرت سے نکلی ہوئی دوسری بولی جانے والی زبانوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا تھا کہ جب یہ زبانیں وسیع ہوں گی اور نہ صرف اپنی عام بول چال بلکہ دوسری زبانوں کی بولی بھولی کو اپنے اندر جذب کر لیں گی تو کیا ہر زبان کے حد مستقل طریقے سے تعین کئے جاسکیں گے۔ ہم کو یہ نہ بھولنا

چاہئے کہ ساتھ برس کے بعد عام مانوی تعلیم (تدقیق) اور مضبوطی سے رائج ہو چکی ہوگی۔ لیکن (Bacon) نے کہا تھا کہ تصنیف و تحریر آدھی میں درستی و صحت کا مادہ پیدا کر دیتی ہیں۔ تحریر سے زبان میں بھی درستی و صحت کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے ہندوستان میں جس قدر جدت اور نہایت فک ترقی بڑھے گی اتنا ہی زندگی اور زبان کا ایک معیار پیدا ہوتا جائے گا۔ لیکن زندہ اور مربوط نظم کے بغیر اس وسعت پذیری کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ گویا اس طرح ہر ہندوستانی زبان کا ایک معیار اور ایک مانوس انداز ہوگا۔ لیکن اس کی کوئی شکل اور زبان کا کوئی مقامی عنصر ادبی حدود سے خارج نہ ہوگا۔ پیشہ وروں کی بول چال، مقامی بول چال اور ادبی بول چال۔ یہ سب کم و بیش ادبی حدود میں داخل ہوں گے۔ ہندوستان کی یہ خاص زبانیں زیادہ ترقی اور جرأت کے ساتھ اپنے اندر لچک اور وسعت پیدا کریں گی تاکہ ہر طرز گفتگو کو شامل کر کے ان کو مضبوط تر بنادیں۔ کئی وجوہ سے آجکل کی تحریر کی زبان زیادہ ڈالائی اور واقعاتی سی بن رہی ہے۔

آجکل عالماء ”حلقے“ جو دقیق و سچیدہ الفاظ کی طرف مایل ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں اس تحریک سے کافی پریشان اور متاثر ہیں کہ ہندوستانی زبانوں کو عوام کی سمجھ، عادات اور ان کے تخیلی اور جذباتی گفتگو کے محاورات سے زیادہ قریب لانا چاہئے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ زبان و ادب کو ”مخصوص پسند“ نہیں ہونا چاہئے اور اس خاص طبقہ کی ملکیت نہ بن جانا چاہئے۔ لیکن ادب بے جان حد تک نہیں گرایا جاسکتا، الفاظ و اسلوب کی یک رنگی نہیں پیدا کی جاسکتی کیونکہ اس سے ادب بے جان ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور سے وکٹوریہ کے وسطی عہد کو لے لیجئے۔ اس عہد کے اسالیب بیان میں حیرت انگیز حد تک تنوع تھا۔ لیر کے اہامی جملات، کارلائل کی آتش فشاں طرز نگارش، میکاے کے پر جوش جملے۔ رسکن کی زریں و پر شوکت نثر، نیوین کے پاک و لطیف محاسن، ہتیو آرنلڈ کا مجتہدانہ اسلوب تھیکرے کا ابقان انگیز مکالماتی انداز۔ اسٹیونسن کا جذباتی طرز۔ والٹر پیٹر کی تجزیہ نگاری۔ یہ سب کچھ آپ کو ملے گا خود شیکسپیر کے یہاں اگر ایک طرف جاہلوں کو خوش کرنے والی زبان پائی جاتی تھی تو دوسری طرف اس کے غلو کا یہ عالم ہوتا تھا گویا اس دنیا کی چیز ہی نہیں۔

میں نے اب تک ان تبدیلیوں کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنی زندہ و مربوط ترقی کے دور میں ہندوستان کی خاص زبانوں میں واقع ہوں گی اور جن کی ہمیں آنے والے عہد میں امید رکھنی چاہئے۔ ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں لکری۔ برہما۔ دیہاتی گیت۔ عوام کی کہانیاں، تنک بندیاں، پیدائش موت کے گانے مزدوروں کے گانے۔ سپیروں کے گانے۔ جادو گروں کے گانے اور منتر موجود ہیں لیکن ان کا صرف ایک غیر محسوس باوجود ہے۔ انکو بہت جلد جمع کر کے نشر کرنا ہوگا۔ یہی حال عوام کی کہاوتوں ضرب الامثال اور مخصوص بولیوں کا ہوگا۔ اسکے بعد ان چیزوں کا ادبیات کے اندر دخل و جذب کا عمل شروع ہوگا اور اسی کے ساتھ ان زبانوں کے غیر متعین

حدود متعین ہونا شروع ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی حدود ختم ہو کر ایک عام سماجی مساوات کے قیام کا عمل بھی جاری ہوگا۔ جس سے نئے سماجی پہلو نمودار ہوں گے۔ ہندوستانی عوام کے صبر و اطمینان میں پہلے ہی سے حرکت پیدا ہو چکی ہے اور اب یہ تحریک تیز و شدید تر ہوتی جا رہی ہے اس لئے عام ثانوی تعلیم کی وجہ سے ہندوستان کی یہ خاص زبانیں زیادہ مضبوط و مستقل ہو جائیں گی۔

زبانوں کی اس وسعت کا ایک دلچسپ اور اہم نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ان میں ان علمی اور اصطلاحی الفاظ کا سیلاب جاری ہوگا جو مختلف آلوں یا مشینوں سے متعلق ہوں گے۔ یہ الفاظ اکثر موقعوں پر بالکل بدیہی ہوں گے اور بعض اوقات انہیں ہندوستانی شکل بھی دیدی جائے گی۔ البتہ کبھی کبھی خالص ہندوستانی اصل کے الفاظ بھی ملیں گے۔ عوام و خواص، دونوں ان الفاظ کی تشکیل و رواج میں حصہ لیں گے۔ آج ہماری تصنیفات کے بیانی و واقعاتی اور تخیلی حصوں میں ریل، فن، ہوا بازی، جہاز رانی، فیکٹریوں، دواؤں، جراحی، انجینری وغیرہ کے متعلق الفاظ بالکل مفقود ہیں۔ پروفیسر سنڈبری (Sainkberry) نے لکھا ہے کہ لائف آف ٹائن لکھتے وقت ساؤدی کو بحری زندگی سے متعلق ایسے فقرے سے سابقہ پڑا اور اتنی ہوشیاری کی ضرورت پڑی ہے گویا کوئی بلی جینی کے برتنوں سے گزرے۔ ساؤدی کی "لائف آف ٹائن" اور کوناٹڈ کے ناولوں کے پڑھنے والے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان میں کتنی کثرت سے علمی اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے۔ پارڈی نے نجومی حقیقتوں اور شکلوں کے حسب قدر صاف تذکرے کر دیے ہیں اور مزدوروں یا کسانوں کی زندگی کے جیسے مانوس نقشے پیش کئے ہیں وہ قارئین کے لئے بیک وقت دلچسپ بھی ہیں اور صبر آزمایا بھی اس میں شک نہیں کہ فرنگی زبانوں کے اثر سے ہماری زبان اس رنگ کو قبول کر رہی ہے، لیکن ابھی تک صرف ذہنی اور تخیلی ادب میں اس کا اثر ہو رہا ہے اور عوام کی متنوع زندگی سے متعلق ہونے والے الفاظ کی بہت کمی ہے۔ سوامی رام تیرتھ نے امریکہ کے باشندوں پر فخر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا کہ ہر چند وہاں کی ابتدائی کتابیں بلی اور کتے سے شروع ہوتی ہیں اور ہماری کتابیں ہمیشہ خدا سے شروع ہوا کرتی ہیں، لیکن اگر کوئی یہ سوال کر بیٹھے کہ کیا اسی وجہ سے فطرت اور حقیقت پر ہماری گرفت ڈھیلی نہیں پڑ گئی ہے تو ہم کیا جواب دیں گے؟ الغرض ہمارے ادب کو اب فطرت و حقیقت پر زیادہ مضبوط گرفت حاصل کرنی ہے۔ دماغ اور ہاتھ کی باہمی بیگانگی کا دور کافی طویل ہو چکا ہے ہتھوڑے اور ہنسیا کو بھی ہمارے ادب میں مناسب جگہ ملنا چاہئے اور حقایق زندگی کو ہندوستان کے ادبیات میں زیادہ سے زیادہ نمایاں ہونا چاہئے۔ اس جگہ شیکسپیر مجھے پھر یاد آتا ہے جس کے ادبیات کے تنوع کو دیکھ کر کارلائل نے کہا ہے کہ اگر وہ

۱۔ (Nelson) مشہور انگریزی امیر البحر کا نام ہے جس نے نیپولین کے مشہور فرانسیسی بیڑے کو شکست فاش دی اور اسی جنگ میں مارا گیا۔ انگریزوں کا زبردست قومی ہیرو ہے اور ساؤدی نے اس کے سوانح حیات لکھے ہیں۔

کوئی بڑا شاعر نہ ہوتا تو ایک بڑا سپاہی ہوتا یا بڑا کسان یا بڑا دستکار۔ بہر حال زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی حیثیت ممتاز ہی تھی۔ اب یہاں بعض اصولی مسائل سامنے آتے ہیں۔ تہذیب نے ادب کی طاقت اور امکانی قوتوں کا بہت دھندلا سا اندازہ کیا ہے۔ ابھی عام اور موثر طریقے کی ثانوی تعلیم کا نفاذ تو نہیں ہوا لیکن ہم اس عہد سے قریب ہوتے جا رہے ہیں اور وہ منزل دور نہیں کہ ہم اپنے اس خواب کی عملی تعبیر دیکھ سکیں۔ اس دور کا سب سے زیادہ اہم سوال اور ہماری اجتماعی زندگی کا سب سے زیادہ نازک مسئلہ ”بچے اور ان کا ادب“ ہے۔ سن رسیدہ آبادی بڑھ کر ویسی ہی ہوگی جیسے ہمارے بچے ہوں گے۔ ہم کو بہت جلد بچوں کے لئے لاکھوں کتابوں کی ضرورت پڑنے والی ہے۔ علم بچا اور شروع کی پرائمریوں سے لیکر احمقانہ و عقلمندانہ نشر و نظم سبق آموز کہانیوں، مثیلوں جن دہری کی کہانیوں، سیاحتوں، ہمت افزا داستانوں تاریخ، جغرافیہ، سوانح حیات، مضامین، ناول، ڈرامے، روزمرہ سائنس کی کتابوں۔ قاموس و لغات میگزین تصویریں کے اہم اور نقشوں تک ہر چیز کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے ہم کو بہت جلد اس کی فکر کرنی چاہئے کہ مصنفوں، مؤلفوں مترجموں اور اڈیٹروں کی ایک پوری فوج اس کام میں منہمک ہو جائے اور موجودہ صدی کے ختم ہوتے ہوئے اس مقصد میں کافی کامیابی حاصل ہو جائے۔ یہ اتنا مفید کام ہے کہ ہماری صوبہ جاتی حکومتوں لیڈروں اور ماہرین تعلیمات سب کو ملکر اس طرف توجہ ہونا چاہئے۔ شیرخواری سے چودہ برس کی عمر تک یہ نہایت اہم اور ضروری امر ہے کہ ہر لڑکے اور لڑکی کی اپنی ضرورتوں کے مطابق بہترین ادب تک آسانی سے رسائی ہو سکے۔ اس کے علاوہ بچوں کے ادب میں بالغوں کے ادب کا بھی اچھا خاصہ حصہ بچوں کے مذاق کے مطابق کاٹ چھانٹ کر شامل کرنا ہوگا۔

ہر چند مطالعہ کی عادت سے جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے اس کا دار و مدار زیادہ تر شخصی رجحان پر ہے، لیکن اگر ہم چاہیں تو اس میں مسلسل ترقی پیدا کر سکتے ہیں۔ بچوں کے مطالعہ کو بے لطف، خشک اور مشکل کتابوں تک محدود رکھنے سے یہ تو ممکن ہے کہ آپ سو فیصد میٹرک۔ اور لاکھوں گریجویٹ پیدا کر لیں لیکن آپ مطالعہ کو ایک قومی عادت بنانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آپ کی قوم دلچسپی لیکر پڑھنے والوں کی نہیں بلکہ کلرکوں کی قوم ہوگی۔ مطالعہ کی عادت یا سوچنے اور رائے قائم کرنے کی عادت ابتداء عمر ہی میں پڑ جانی چاہئے۔ بعد کے سالوں میں اس میں صرف نچنگی پیدا ہوتی ہے۔ ہم اس اہم نفسیاتی حقیقت کو اکثر بھول جاتے ہیں کہ بچے کتابوں اور مطالعے کو پسند کرتے ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں کہ یا تو ان کی اس ذہنی اشتہا کو ختم کر دیتے ہیں یا پھر غیر مناسب اور تھکا دینے والی کتابیں دیکر ان کے دل سے مطالعہ کی تمام محبت کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس افسوسناک صورت حال کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ کچھ ایسی نظموں، کہانیوں یا کتابوں کو یاد کرنے کی کوشش کیجئے جن کی یاد اب بھی آپ میں غیر معمولی جوش و حسرت پیدا کر دیتی ہو اور جنہوں نے آپ کے عہد طفلی کو روشن کر رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ مشکل ہی سے ایک دو ایسی مثال یاد کر سکیں یا ممکن ہو کوئی نہ یاد آئے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے گریجویٹ نوے فی صدی (جہاں تک

مطالعہ کی قومی عادت کا تعلق ہے) ان پڑھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اخباروں پر وقتی طور سے، معمولی دلچسپی کے ساتھ نظر ڈال لینے کے علاوہ جس میں غور و فکر کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہوتا وہ شاید اور کچھ نہیں پڑھتے۔ یہ تمنے کا دوسرا رخ ہے اور ہندوستان میں انگریزی تعلیم پر میکائے کی مشہور رپورٹ کی دوسری توضیح شاید میکائے کی تنجس نگاہوں کے لئے یہ مسئلہ اس قدر واضح تھا کہ وہ اس کو نہ پاسکے۔ سال بہ سال ہم لوگوں کو یونیورسٹی میں سیکڑوں انڈرگریجویٹوں سے سابقہ پڑنے کا صبر آزما اور تکلیف دہ تجربہ کرنا پڑتا ہے۔ قابل افسوس امر یہ نہیں ہے کہ ان کا دماغ اُلجھا ہوا ہوتا تو قابل افسوس امر یہ ہے کہ ان کا دماغ بالعموم خالی رہتا ہے اور حقیقتوں سے ان کو کوئی ذوق نہیں ہوتا۔ اپنے ذہنی خلا کے باعث وہ بالکل مردہ دیوار کے مانند ہو جاتے ہیں۔ ان کو ذہنی اخذ سے ایک فطری مخالفت سی ہو جاتی ہے اور کسی چیز پر بحث کرنے یا غور کرنے یا کسی سوال کے پوچھنے یا اس کا جواب دینے سے قطعاً گریز کرنے لگتے ہیں۔ ان کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی یہ محض طلباء کی غلطی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ بیچارے تو ایک ایسے بے رحم نظام کا شکار ہوتے ہیں جو بے ضرورت دباؤ، غلامی، مفلسی، اقتصادی لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہوتا ہے اور تمدنی ترقی کو شروع ہی سے اُلجھا دوں میں پھنسا کر بالکل خاتمہ کر دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی طفلی اور شروع جوانی کے درمیان میں لڑکے اور لڑکیوں کی انگلیاں اور نگاہیں ایسے لاکھوں صفحوں سے گزرتی ہی ہیں جو نوخیز عمر والوں کے استعمال کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں اور جوان کی مناسب ذہنی غذا کا کام دے سکتے ہیں۔ بچوں کے کثیر اور تندرست ادب کے بغیر قوم کی ذہنی بھوک شروع ہی میں مرجاتی ہے۔ بچوں کی مناسب کتابوں کا کال ان کے جوشیلے ذوق کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ ان کے دل ریگستان میں پیدا ہونے والے پھولوں کی طرح خاموشی سے کھلا جاتے ہیں۔ اپنی قومی زندگی کے گہوارہ اور بنیاد سے بیگانہ رہنے میں ہمارے لئے زبردست خطرے ہیں اور پھر اب تو اس بے نیازی کی بھی انتہا ہو گئی!

اس لئے اگر آئندہ صدی تک ہمیں کچھ کرنا دھڑنا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ابھی سے نوخیزوں کے لئے مناسب متنوع اور متدرج ادب کی کافی پیداوار پیدا کریں اور عام استعمال کے لئے نہایت وسیع اور ہمہ گیر طریقہ عمل ہوشیاری سے مرتب کریں۔ مناسب ہو گا کہ ایک دو الفاظ میں اس کا بھی تذکرہ کرتا چلوں کہ یہ کتابیں کس طریقہ کی اور کن خصوصیات کی حامل ہوں گی۔ میری رائے سوامی رام تیرتھ کے اعتراض کے باوجود یہی ہے کہ بچوں کی کتابوں میں خدا نہیں بلکہ کتے اور بلی کا عنصر زیادہ ہونا چاہئے۔ بچوں کا وجود بالکل فطری وجود ہوتا ہے۔ ان کو مذہب سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے نہ اخلاقیات سے۔ اب وہ دور ختم ہو چکا ہے جبکہ بچوں کی کتابوں کی بنیاد مذہبی اور اخلاقی کلیات پر رکھی جاتی تھی۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اس امر میں ان کی مدد کریں کہ پُرانے وراثتی تعصبات اور نفسیاتی کمزوریوں سے آزاد ہو کر سوچیں اور سمجھیں۔ مذہبی اور اخلاقی تربیت کی جگہ اب ذہنی اور فراستی تعلیم کو لے لینی چاہئے تاکہ دل دماغ اور ہاتھوں کے تعاون سے ایک نیا اور معقول تمدن پیدا کیا جاسکے۔ احترام کا جذبہ خدا کے ماننے پر مبنی نہیں ہے

نہ کسی مخصوص مذہب یا عقیدے کا ٹھیکہ ہے۔ لہذا بچوں کے ادب میں مذہب اور اخلاقیات کا نہیں بلکہ ٹھوس عادی چیزوں کا پلہ بھاری ہونا چاہئے۔ بچوں کا ادب بناتے وقت سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ پڑھنے والوں میں فطری اور سماجی اصولوں سے دلچسپی پیدا کی جائے۔ بچے بے حقیقت ہوائی باتوں سے تھک جاتے ہیں اور عام اخلاقی بکواس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ فرنیکن کی (Fennell) سے لیکر سیمویل اسمائیاس کی (K. K. Smith) تک۔ اس قسم کا تمام ادب ایک ناقابل فہم دور سے آنے والی پیچ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے قصے میں سرمایہ کی طرف سے ہم کو خوفزدہ بنادیتے ہیں۔ بچوں اور نوخیزوں کے لئے جو ادب ہے اس میں ہمیشہ ایک مخصوص سماجی مقصد کی جھلک ہوتی چاہئے اور ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں موجودہ سماجی نظام کی مخالفت کو تپا پڑے گی اور یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ بچوں کا ادب نہ صرف تعمیری بلکہ تخریبی بھی ہوتا ہے۔ سورماؤں کی کہانیاں۔ کنگسلے کے افسانے یا پلوٹارچ کی تاریخی کہانیاں فائدہ مند بھی ہیں اور مضر بھی۔ کیونکہ نوخیزوں میں وہ ذاتیات کے جذبات ابھارتی ہیں میں مانتا ہوں کہ ایسی کہانیاں اور خصوصیت سے پلوٹارچ عصر جدید کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا لیکن نوخیزوں کی زندگی کے تشکیلی اثرات میں ان کی تھابلی اہمیت بہت بدل جائے گی۔ وہ سورما نہیں جو اپنے علاوہ اور کسی کے لئے سورما نہ تھے بلکہ سورما وہ تھے جو بڑی بڑی تعمیری حیات کے سرگروہ تھے اس لئے ان کے سوانح حیات ایسے صاف اور مانوس انداز میں پیش کرنا چاہئے کہ نوخیزوں کے لئے ترقی پسند احساسات کو بھلا معلوم ہو۔ لیکن ان کو ایک رخی تعریف پر ختم نہ ہونا چاہئے۔ ان کی زندگی کی محدود دشیتیں، ان کے مانے ہوئے مہلک اصول اور مسلمات بھی صاف صاف بتا دینا چاہئے۔ ہمارے سورما اچھے ہوں یا برے لیکن بچوں میں سورما پرستی کے جراثیم نہ پیدا کرنے چاہئیں۔ تاہم طرز نگارش کچھ ایسا ہونا چاہئے جو نوخیز قارئین کے دلوں میں احترام کے جذبہ کو مضبوط سے مضبوط تر بنادے۔

ان اہم امور کو مد نظر رکھتے ہوئے سوانح عمریوں کی ایک قومی بلکہ بین الاقوامی قاموس کا کام فوراً شروع ہو جانا چاہئے، بچے صرف بچے ہی نہیں ہوتے اور نہ سب ایک سے ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہوتے ہیں۔ کھیل کا فطری مادہ اور ذہنی رجحان جو اپنی مختلف صورتوں میں نمودار ہوتا ہے، یہ دونوں تہیں حقیقت ایک ہی چیز ہیں، بربری اقوام میں بھی فلسفہ داں۔ سائنس داں۔ موجد حسن کارسیاح۔ تجارت۔ ناظم اور رہنما ہوتے ہیں۔ خارجی اور داخلی اسباب نفسیاتی وجوہ اور تمدنی و تاریخی ماحول کی وجہ سے ہمارے ہندوستانی بچے مغربی بچوں سے زیادہ تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔ بچوں کا ادب بنانے والوں کو ارزاں حب الوطنی اور ناقابل برداشت طفلانہ پن سے احتیاط لازم ہے۔ بچوں کی کتابوں کو وسیع حدود اور متنوع اقسام کا ہونا چاہئے۔ جس میں ایسی لطیف اشارہ انگیز نثر پائی جاتی ہو کہ بیک وقت روشن دماغی، اضافہ معلومات اور تحسّس ذہنی پیدا کرے

کیوں نہ ہم دور جدید کی ایک نئی (*Modernism*) ایک نئی (*Modernism*) اور ایک نئی جنگل کی کتاب پیدا کریں جو عصر جدید کے ترقی یافتہ اور اضافہ شدہ علم پر مبنی ہو۔ ڈارون، وٹس، میٹرلنگ اور کروٹون ایسے مصنفین کی کتابوں کے اقتباسات اور سائنس کے عجائبات کے تذکرے جب کہ ورول ٹرکوں کے سامنے پیش ہوں گے تو ملک کے اس نوخیز طبقے میں ایک ذہنی۔ اخلاقی اور روحانی ترقی کی لہر دوڑ جائیگی جنسیات کے مشکل مسائل کو بھی کافی ہوشیاری اور توجہ کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ ایک ایسا سماجی احساس پیدا کرنے کے لئے جو پوری دنیا پر محیط ہو، ایک تشدد آمیز قومیت یا فرقہ پرستی کے جذبات کو روکنے کے لئے رجعت پسندانہ ذہنیت کو کچلنے کے لئے (*Mythology of man*) (انسان کی شہادت) ایسی کتابوں کو کافی ہر دلعزیز بنانے کی ضرورت ہوگی، تاکہ نہ صرف ان کے دماغوں بلکہ ارادوں کی بھی مناسب تربیت و ترقی ہو سکے شہنشاہیت سرمایہ داری اور مذہب اس عمل کو مدتوں سے روکتے رہے ہیں اس لئے بغیر کسی رعایت کے ان کا بھرم کھولنا چاہئے۔ مافوق الانسانی طاقتوں کی عقیدہ مندی کو بھی ختم کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے لئے شاعری اور روحانیت کا خاتمہ لازمی نہیں۔ سائنٹفک خیالات کا انداز بھی کوئی بھرا اور غیر لطیف انداز نہیں ہے۔ آواز کائنات کا مسئلہ۔ جغرافیہ۔ باغبانی۔ علم الحیوانات۔ علم النبات۔ علم النسل اور معاشیات یہ سب ضمیر کی پوی پابندی کے ساتھ بچوں کو حاصل کرانے چاہئیں۔ بچوں کی کتاب کو گند۔ بے لطف اور پھیکا بنا دینا سب سے بڑی خرابی ہے اور یہ پھیکا پن عموماً سطحی اور محدود علم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سماجی احساس۔ سماجی ارادہ و مقصد اور سماجی خیالات کو بچوں کی ذہنی زندگی کا ضروری جزو بنا دینا نہایت ضروری ہے۔ مجھے یہ محسوس کر کے شدید تکلیف ہوتی ہے کہ ہمارے مشاہیر میں بھی سماجی احساس کا فقدان ہے۔ آج متوسط طبقے کی رسمی نیکیوں سے کام نہیں چلے گا بلکہ ہم کو صرف مفید چیزوں کی ضرورت ہے۔ ہم کو ایسی کتابیں چاہئے جن میں تصویریں ہوں، گانے ہوں، نظمیں ہوں، کہانیاں ہوں، مکالمے ہوں، ظرافت ہو، سائنٹفک معلومات ہوں، ایجادات کی کہانیاں ہوں، لطیفے ہوں، نقشے ہوں، معے اور پہیلیاں ہوں اور مذہبیات و اخلاقیات سے ان کو کوئی لگاؤ نہ ہو۔ سماج کو بھی زندہ صفت اور زندگی بخش ادب کی پیداوار چاہیے کہ فن سیکھنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ تمام صوبوں کے وزرائے تعلیم کو فوراً اس اسکیم پر کاربند ہونا چاہئے اور قابل آدمیوں کی ایک جماعت تلاش کر کے ایک مرکزی ادارہ تعمیر نصاب کا قیام کرنا چاہئے۔

احمد حسین

”مکتوبات“ میں ایک غلطی کی تصحیح

مارچ کے مکتوبات میں صفحہ ۶۱ پر جو شعر غالب سے منسوب کیا گیا ہے وہ ذوق کا ہے۔ محمد عبداللہ صاحبام۔ لے (گورنمنٹ کالج لالیپور) کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس غلطی کی طرف مجھے متوجہ کیا۔ نیاز

مصطفیٰ نمبر کی بعض لغزشیں

نگار کا مصطفیٰ نمبر دیکھا، میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے، تقریباً سب مضامین اچھے ہیں لیکن نہیں حیات مصطفیٰ خوب ہے اور یہ سچ ہے کہ اگر آپ صرف یہی مضمون شائع کر دیتے تو کافی تھا، لیکن اس نمبر میں بعض اہم لغزشیں بھی ہیں جن کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ ”نگار“ جیسے موقر رسالہ میں اس قسم کی غلطیاں رہ جائیں۔ صفحہ ۴۴۔ امیر احمد صاحب نے لکھا ہے کہ ”میراعلا علی کے فرزند میر انس مصطفیٰ کے شاگرد ہوئے“ یہ غلط ہے میر انس مصطفیٰ کے شاگرد کبھی نہیں ہوئے۔

صفحہ ۴۹۔ ”مرغ نامہ مرزا قلی“ کو مختصر اور چھوٹی سی تنوی سمجھنا بھی عجیب ہے۔ مصطفیٰ کی سب سے مختصر تنوی قوم شیخ ہے لیکن اس میں بھی تیس اشعار ہیں۔

صفحہ ۵۰۔ ”عیشی نے اپنے دیوان میں مصطفیٰ کو اپنا استاد لکھا ہے۔“ عیشی کا دیوان فقیر کی نظر سے گزر چکا ہے اس میں کہیں عیشی نے مصطفیٰ کو اپنا استاد نہیں لکھا۔

صفحہ ۵۳۔ ”مہدی نواب وزیر مرحوم کی حیات میں مصطفیٰ کے شاگرد ہوئے۔“ مہدی مصطفیٰ کے شاگرد نہ تھے، ان کا حال ریاض الفصحا میں موجود ہے لیکن شاگردی کا کہیں تذکرہ نہیں، مصطفیٰ کچھ دنوں ان کے یہاں ملازم ضرور رہے تھے ان کی شان میں مصطفیٰ نے قصاید بھی لکھے ہیں جو فقیر کی نظر سے گزر چکے ہیں، مصطفیٰ نے ان کو اپنا شاگرد نہیں لکھا لیکن بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں مستفیضان مصطفیٰ میں شمار کیا ہے، فقیر کے خیال میں ان کا شاگرد ہونا مشکوک ہے، یہ ٹھیک ہے کہ آخری زمانے کے بعض شاگرد ایسے ہیں جیسے مظفر علی اسیر، شہیدی وغیرہ جن کا ذکر مصطفیٰ نے نہیں کیا لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ تکمیل تذکرہ ریاض الفصحا کے بعد شاگرد ہوئے تھے۔ مہدی سے سلسلہ ملازمت دوران تالیف تذکرہ میں قائم ہو چکا تھا، اگر شاگرد ہوتے تو مصطفیٰ ضرور تذکرہ کرتے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ تکمیل تذکرہ کے بعد اصلاح لی ہوگی لیکن یہ بھی قرین قیاس نہیں کیونکہ سعادت علی خاں کے انتقال کے چند ہی سال بعد مہدی علی خاں نے آغا میر وزیر غازی الدین حیدر (جانشین سعادت علی خاں) کے ظلم سے تنگ آکر لکھنؤ چھوڑ دیا تھا۔

صفحہ ۶۰ - آتھی صاحب نے ”ثنوی مودعی خانہ“ کا تعلق شاہ عالم سے بتایا ہے حالانکہ یہ ثنوی سیماں شکوہ سے متعلق ہو شاہ عالم سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ صفحہ ۹۶ - آتھی صاحب لکھتے ہیں کہ ”آبرو کی ثنوی کا وجود نہیں صرف نام باقی ہے آبرو کی ثنوی“ ”معدنۃ مشوق“ عرصہ ہوا جناب مرزا فرحت اللہ بیگ ”اردو“ عید آباد میں شائع کر چکے ہیں۔ یہ وہی ثنوی ہو جس کا ذکر قایم نے ”مخزن نکات“ میں کیا ہے۔ صفحہ ۱۰۶ - آتھی صاحب نے یہ ثنوی سودا کی طرف منسوب کی ہے۔

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید . صبح نکلے سہے کا پنتا خورشید

یہ ثنوی سودا کی نہیں، سودا کے شاگرد قایم کی ہے، ثبوت کے لئے یہ چند دلیلیں کافی ہوں گی۔

(۱) کلیات قایم کے قلمی نسخہ میں یہ ثنوی موجود ہے، (۲) میر حسن اور قدرت اللہ شوق جیسے معتبر تذکرہ نگار اپنے تذکروں میں اس ثنوی کو قایم ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہ دونوں تذکرے سودا کی زندگی ہی میں لکھے گئے ہیں، یہ خیال رہے، اس کے علاوہ سودا کے ان قلمی دو انین میں یہ ثنوی نہیں پائی جاتی جو اس کی زندگی میں لکھے گئے اور ان نسخوں میں بھی اس کا پتہ نہیں جو اس کی وفات کے پس و پیش مرتب ہوئے ہیں، اصل یہ ہے کہ قایم کی ثنوی سودا کے پاس اصلاح کے لئے آئی سودا آئے اصلاح دی لیکن واپس نہ ہوئی مرتب دیوان (غلام احمد) جب دیوان سودا مرتب کرنے لگے تو اس میں اسے بھی داخل کر دیا۔

صفحہ ۱۳۲ - حسرت صاحب نے لکھا ہے کہ ”مصحفی غزلیں بیچتے تھے اچھے اشعار دوسرے لے لیتے تھے اور برس خود اپنے لئے رکھ چھوڑتے۔ غلطی شروع شروع آزاد مرحوم سے ہوئی پھر اور لوگوں نے آنکھیں بند کر کے نقل کرنا شروع کیا۔ اسی غمچہ پر حسرت نے ناسخ کو مصحفی کا شاگرد بنا دیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔

تمام مضامین میں سب سے زیادہ دلچسپ مضمون جناب مشیر احمد علوی کا ”مصحفی کی دو گم شدہ بیاضیں“ ہے اس میں شک نہیں کہ یہ مضمون لکھ کر مشیر صاحب نے آرٹ پیدا کرنا چاہا ہے لیکن اس مضمون کو شائع کر کے آپ نے آرٹ کی تکمیل کر دی ہے۔

اگر مجھے دھوکا نہیں ہو رہا ہے (جس کی اُمید کم ہے) تو میں یہ کہہ دینے کے لئے تیار ہوں کہ ”مصحفی کی دو گم شدہ بیاضیں“ جعل کا بہترین نمونہ ہے اور ”بیاضیا“ اور ”نور ازل“ جناب مشیر کے بحر تخیل کی صرف موجیں ہیں اور بس! مضمون دلچسپ یوں زیادہ ہو جاتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ واقعات کی بے ربطی، سین کی غلطی، اور بیانات کے الجھاؤ سے پورا مضمون بھرا پڑا ہے اور ان ہی بیانات نے مشیر صاحب کو بنا بنایا قلم سمار کر دیا ہے۔

سب سے پہلے جناب مشیر احمد کی تمہید ہے لیکن میں حیران ہوں کہ اسے میں جناب مشیر کی عبارت سمجھوں یا مولانا عبدالحق بی، اسے کی جب آپ میری طرح مصحفی کے کسی ایک تذکرہ کے مقدمہ کو اٹھا کر لکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے، پورے مضمون میں یہ مشکل چند سطر میں جناب مشیر کی اپنی ہوں گی، کچھ مصحفی کی عبارتوں کے ترجمے ہیں اور

کچھ مولانا عبدالحق کے مقدمہ کی ترمیم۔

شاعری کا ستارہ اودھ میں اسوقت چمکا جبکہ تیموری اقبال
بام تھا اور شاعری رفتہ رفتہ ایک پیشہ ہو کر رہ گئی تھی اور اس
عصر کے شاعر متاع ہنر کو کاسہ گدائی بنائے ہوئے در بدر آوارہ گردی کر رہے
تھے۔ مشیر احمد علوی۔ مصحفی کی دو گمشدہ بیاضیں
ضروریات زندگی کے ذرائع محدود تھے، شراب و حسرت یاں
یورپ کی طرف چل کھڑے ہوئے اور وادی غربت میں قدم
رکھا۔

بیت اسلام کی حالت خواہ کتنا ہی اتر کیوں نہ رہی ہو۔۔۔
۔۔۔ اس نے اپنے دلوں پر پتھر رکھ کر عزیز وطن کو خیر باد کہا مگر
عمر بھر یہ داغ مفارقت نہ مٹا۔ صفحہ ۱۲۰

مصحفی کو دربار میں گئے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ درباری حدود و رشک
رقابت و غمازیاں۔۔۔ عیاریاں اور افزائے پر دازیاں۔۔۔ استعمال ہونے لگیں۔
انشاء جرات مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے، اول اول
شاعرانہ چشمک رہی بعد میں یہ رنگ جنگ و جدال اور فحش
ہزلیات میں مصحفی اور انشاؤں نے وہ کیچڑ اچھالی کہ تہذیب نے
آنکھیں نیچی کر لیں۔

۔۔۔ نواب وزیر احمد صاحب عالم نے بھی اس میں حصہ لیا اور لطف اندوز
ہوئے اور شہر والوں کو ایک دل لگے ہاتھ آئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طراری
تیرسی اور شوخی سے بازی لے گئے۔ صفحہ ۱۲۱

مصحفی کے استاد ہونے میں کئی شبہ نہیں ہے، بڑے شائق اور ریختہ گو
ریختہ گو شاعر تھے، آٹھ دیوان متعدد قصاید اور مثنویاں انکی تصنیف سے ہیں
تصنیف کیں۔ تنقید مصحفی نمبر ۵ صفحہ ۱۲۲

یہ تو تبید کا حال ہے اب آئیے اصل مضمون کی طرف، معلوم ہوتا ہے کہ مشیر صاحب نے مصحفی کے تینوں تذکرے
(مطبوعہ) سامنے رکھ لئے اور کچھ کتاب کی مدد سے اور کچھ مولانا عبدالحق کے مقدمہ کی نقل کر کے مضمون تیار کر لیا۔

اُردو شاعری کا ستارہ اسوقت چمکا جبکہ سلطنت مغلیہ کا
آفتاب گہوارا تھا، رفتہ رفتہ شاعری ایک پیشہ ہو گئی اور اس عہد
کے باکمال سخنور اپنے متاع ہنر کو در بدر لے پھرتے تھے۔
مولانا عبدالحق بی۔ اے مقدمہ تذکرہ مصحفی صفحہ الف
بہر اوقات کے ذرائع تنگ ہو رہے تھے ناچار اپنے دوسرے
مضمون کی طرح دل پر پتھر رکھ کر دلی کو خیر باد کہا اور وادی
غربت میں قدم رکھا۔

دلی کی حالت اسوقت کیسی ہی ہو اس کا چھوڑنا آسان کام
نہ تھا وطن تو خیر سب ہی کو عزیز ہوتا ہے۔۔۔ لیکن مرتے دم تک
اس کا داغ دل سے نہ مٹا۔ صفحہ ج

ہمارے درباروں میں حدود و رشک، رقابت و غمازی۔۔۔۔۔
عیاریاں اور افزائے پر دازیاں کام میں لائی جاتی ہیں۔
انشاء جرات اور مصحفی خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے اول اول
شاعرانہ چشمک رہی بعد میں بڑھتے بڑھتے نوبت جنگ و جدال اور فحش
اور پھلکڑک پہنچ گئی۔ ان ہزلیات میں مصحفی اور انشاؤں نے وہ
کیچڑ اچھالی کہ تہذیب نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

۔۔۔ جس کے مزے صاحب عالم اور نواب بھی لیتے تھے اور شہر والوں
کو ایک دل لگی ہاتھ آئی نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طراری
شوخی سے بازی لے گئے۔ صفحہ ۵

مصحفی کے استاد ہونے میں شبہ نہیں بڑے شائق اور ریختہ گو
شاعر تھے آٹھ دیوان، متعدد قصاید اور مثنویاں انکی تصنیف سے ہیں
مقدمہ تذکرہ مصحفی شائع کردہ انجمن ترقی اردو

صفحہ ۱۴۱ پر مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ”سنہ ۱۱۸۰ھ میں سلیمان شکوہ لکھنؤ میں داد عیش دے رہے تھے اور غلام بھائی مصطفیٰ دربار سے منسلک تھے۔“ سنہ ۱۱۸۰ھ میں تو شاید سلیمان شکوہ ایام رضا عت میں ہوں گے، لکھنؤ میں ٹھیکہ دار داد عیش کیا دیتے مصطفیٰ بھی سنہ ۱۱۸۰ھ کے بعد کہیں آئے ہیں اور سلیمان شکوہ کے دربار میں منسلک ہوئے ہیں یہ زمانہ سنہ ۱۲۰۵ھ سے سنہ ۱۲۰۹ھ یا سنہ ۱۲۰۹ھ تک محدود ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ:۔ ”سنہ ۱۲۰۹ھ میں مصطفیٰ کو دربار میں جگہ ملی۔“ سنہ ۱۲۰۹ھ کی تفصیل کی مضمون نگار کے پاس کیا دلیلیں ہیں؟ سلیمان شکوہ سنہ ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ پہنچے تھے قطعی طور پر یہ کہنا دشوار ہے کہ مصطفیٰ کس سنہ میں سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے۔ صفحہ ۱۴۰۔ ”نواب وزیر اودھ مچھل ہلاتے تھے اشرفیاں پاتے تھے“ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے مضمون نگار کا کیا مطلب ہے۔ وعدہ تو یہ تھا کہ امرا اشرفیاں نذر پیش کیا کرتے تھے اور بادشاہوں اور شہزادوں کی طرف سے خلعت ملتا تھا۔ مضمون نگار کی اگر ان لفظوں سے کچھ اور مراد ہے تو ہو لیکن کم از کم اس عبارت سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۴۱۔ ”نواب وزیر اودھ صاحب عالم نے بھی اس میں حصہ لیا“ کوئی معتبر ثبوت؟

صفحہ ۱۴۲۔ ”ناسخ اسی دہستان کے پرورش یافتہ تھے۔“ مضمون نگار کا یہ بیان صحیح نہیں!

اب تذکرہ شروع ہوتا ہے شروع میں (بقول جناب مشیر) مصطفیٰ کا مقدمہ ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مقدمہ کی یہ عبارت تذکرہ ہندی کی عبارت کی نقل ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ مصطفیٰ فارسی نثر لکھنے سے اتنا عاجز تھے کہ چند سطریں دوسری نہیں لکھیں بلکہ اپنی دوسری تصنیف کی لکھی ہوئی سطریں نقل کر دیں۔ دونوں عبارتیں ملاحظہ ہوں:-

بتکلیف عزیز لہجان لالہ کا نجی مل صبا قوم کا بیتہ سکینہ کوطن	لالہ کا نجی مل صبا قوم کا بیتہ سکینہ کوطن
بزرگان نش فیروز آباد و جودش در لکھنؤ نشوونما یافتہ فرانش تذکرہ	و خودش در لکھنؤ نشوونما یافتہ فقیر در ایام کے وارد ہیں شہر بود
ہنود نمودند فقیر در ایام کے وارد ہیں شہر بود چند حسب اتفاق	چند حسب اتفاق بر مکان ایشاں اقامت داشت، مشارالہ
بر محل برائے ایشاں اقامت داشت، مشارالہ در ایام	در ایام بمقتضائے موزونی طبع شوق شعر پیدا کردہ چیزے کہ
بمقتضائے موزونی طبع شوق شعر پیدا کردہ شعرے کہ بہ زبان	بہ زبان خودی گفت آنرا از نظر فقیر باعتبار تمام می گزارانید۔۔۔
خودی گفت آن را بہ نظر فقیر باعتبار تمام می گزارند۔۔۔	۔۔۔۔۔ طبعش بخیاں شعر بسیار مناسب افتادہ بود اگر
طبعش بہ خیاں شعر بسیار مناسب افتادہ بود اگر عمرش و قافیہ	عمرش و قافیہ کرد زیادہ ازین قدم بر جادہ ترقی می نہاد
کرد زیادہ ازین قدم بہ جادہ ترقی می نہاد اما حیف کہ بمرتبہ پنجم	اما حیف کہ بہ عمر بست و پنجم سالگی در عین جوانی مدقوق شدہ
سالگی در عین عالم شباب مدقوق شدہ دیر گزشت۔۔۔ و داغ حسرت	در گزشت و داغ حسرت بر دل باقی ماندگان نہاد
بر دل باقی ماندگان نہاد۔۔۔ انرض شوق شعر ہندی داموش	تذکرہ ہندی مصطفیٰ صفحہ ۱۴۱
را بہ حکم فرا گرفته طوطا و کرا قدم دریں دادی پر خسار	۔۔۔ شوق شعر ہندی دامن دلش را محکم گرفتہ طوطا و کرا قدم دریں

گزاشت " مصطفیٰ کی دو گم شدہ بیانیسیں صفحہ ۱۴۲

و بقید حروف تہجی اسامی شعرائے ہند و ہمت گماشت -

(تذکرہ ہندی صفحہ ۳ و ۴)

(صفحہ ۱۴۲ - نگار)

دیکھا آپ نے اچند سطروں کے لئے مشیر صاحب کو کتنا تکلف کرنا پڑا ہے، تذکرہ کی وجہ تصنیف لکھنا ضروری ہے کہ نہیں سکتے تھے کہ وجہ تصنیف مصنف نے نہیں لکھی، اگر چند سطر فارسی کی خود لکھ لیتے تو چودھویں صدی کی فارسی ہو جاتی اور انھیں دکھانا تھا کہ یہ تذکرہ بارہویں صدی میں لکھا گیا، اس لئے سب سے آسان صورت یہ سمجھی کہ مصطفیٰ ہی کی عبارتوں کے مختلف ٹکڑے جوڑ کر چند سطر بنالی جائیں چنانچہ آپ اگر مصطفیٰ کے مطبوعہ تذکروں سے ملا کر دیکھیں گے تو آپ کو پتہ چلیگا کہ "تکلیف از جان" سے "درگزشت" تک تذکرہ ہندی صفحہ ۱۴۱ سے "داغ حسرت بردل باقی ماندگان نہاد" تذکرہ ہندی نسخہ خدا بخش لاہوری بانگی پور سے اور "شوق شعر ہندی" سے "ہمت گماشت" تک تذکرہ ہندی صفحہ ۳ (مقدمہ مصطفیٰ) سے لیا گیا ہے۔

لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو پتہ چلیگا کہ کہیں کہیں پر ہلکا سا فرق بھی کر دیا ہے۔

(۱) اصل نسخہ میں ہے "و خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ" مشیر صاحب نے اس میں ترمیم کر دی "و خودش در لکھنؤ نشو و نما یافتہ"۔ (۲) "نشو و نما یافتہ" کے بعد "فرمایش تذکرہ ہند و نمودند" ٹھوس دیا گیا، شاید یہ سمجھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ "نمودند" کا فاعل کون ہوگا۔ (۳) "بر مکان ایشان" کی جگہ "بر محل سرای ایشان" شعر ہے کہ بہ زبان خود می گفت "کی جگہ" چیز ہے کہ بہ زبان خود می گفت "در عین جوانی" کی جگہ "در عین عالم شباب" لکھ دیا گیا ہے۔ دوسرے تذکرہ کا نام "نور ازل" بتایا جاتا ہے افسوس ہو کہ مضمون نگار نے وجہ تصنیف نہیں لکھی نہ مقدمہ کی کچھ عبارت نقل کی اور یہ اچھا بھی ہوا اور نہ چند سطروں کے لئے پھر ہنگامہ کرنا پڑتا اور مشیر صاحب کو مفت کی زحمت اٹھانی پڑتی تاریخ تحریر ۱۲۰۹ھ لکھی ہے اور مزید شہادت کے لئے مصطفیٰ کا قطعہ تاریخ بھی نقل کر دیا ہے۔

سال اوچوں ز خود بہ پر سیدم یک ہزار و دو صد و نہ بنوخت

لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے تذکرہ ہندی میں بھی یہی قطعہ تاریخ دیکھا، یہ کسی طرح مانے جانے کے قابل نہیں کہ مصطفیٰ نے (جو معمولی سی معمولی باتوں پر قطعہ لکھنے کے لئے طیار تھے) اپنی ایک تصنیف کے لئے قطعہ تاریخ نہیں لکھا، اور وہ قطعہ تاریخ جو دوسری کتاب کے لئے لکھ چکے تھے اسی کو نقل کر دیا۔

افسوس ہے کہ مقالہ نگار نے ان تذکروں پر کافی روشنی نہیں ڈالی، لیکن مختصراً جو کچھ تذکروں کے متعلق لکھا ہے اس میں بھی چند باتیں ایسی آجانی ہیں جن کا مقالہ نگار کے پاس شاید کوئی جواب نہ ہوگا مثلاً یہ کہ:-

(۱) "تذکرہ بدیعنا" میں دوسرا نام گور بخش ادیب کا ہے "یہ تذکرہ ۱۲۰۳ھ میں لکھا گیا پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ

گو بخش ادیب جو تقریباً ۱۲۱۵ھ میں مصطفیٰ کے شاگرد ہوئے ہیں ان کا ذکر شاگرد کی حیثیت سے ۱۲۳۳ھ میں کیونکر درج ہو سکا۔ (۲) قتیل کے حال میں لکھا ہے کہ ”وہ دریائے لطافت کی ترتیب میں انشا کے شریک تھے، دریائے لطافت ۱۲۲۰ھ کے بعد تقریباً ۱۲۲۲ھ میں لکھی گئی ہے براہ کرم مجھے بتایا جائے کہ ۱۲۲۲ھ کے واقعات پندرہویں سال قبل ۱۲۰۳ھ میں کیسے لکھے جاسکے۔ (۳) مرزا تقی ہوس کے بیان میں لکھا ہے کہ ”ان کی عمر چالیس سے متجاوز ہوگی“ واضح رہے کہ یہ تصنیف ۱۲۰۹ھ کی ہے۔ ۱۲۰۹ھ میں ان کی عمر چالیس سال ہے اور آپ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہے گی جب آپ مصطفیٰ کے تذکرہ ریاض الفضا مرتبہ ۱۲۳۳ھ میں بھی دیکھیں گے ”عمرش انہیں متجاوز خواہد بود“ معلوم نہیں ہوسکتا کہ کس قسم کی گولیاں کھائی تھیں کہ ۱۲۰۹ھ میں بھی چالیس برس کے تھے اور ۱۲۳۳ھ میں بھی چالیس ہی برس کے۔

اصل یہ ہے کہ مشیر احمد صاحب نے یہ تمام حالات مصطفیٰ کے تینوں تذکرے خصوصاً عقد ثریا سے لئے ہیں اور عبارت تقریباً وہی نقل کر دی ہے یہاں تک کہ بعض توصفات ترجمہ معلوم ہوتی ہیں اور ان دو بیاضوں کو صحیح مان لینے کی صورت میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصطفیٰ عبارتیں لکھنے سے عاجز تھے (اور قطعات بھی)

مجھے مزہ وہاں پر آیا جہاں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ”انتخاب کوئی نہیں دیا“ حالانکہ اس کی اصل یہ ہے کہ یہ حالات مضمون نگار نے عقد ثریا سے لئے اور عقد ثریا کے مطبوعہ نسخہ میں نمونہ کے اشعار نہیں ملے، عقد ثریا کے قلمی نسخوں میں اشعار موجود ہیں لیکن مطبوعہ میں نہیں کیونکہ عبدالحق صاحب نے قصداً اشعار نہیں رکھے کہ فارسی کے تھے اسی سلسلہ میں اگر تذکرہ مسرور کا ذکر کروں تو بے جا نہ ہوگا۔

صفحہ ۵۴ پر امیر احمد صاحب علوی لکھتے ہیں کہ مسرور کا کوردی نے ایک تذکرہ ۱۲۳۹ھ میں لکھا اور مزید شہادت کے لئے خاتمہ کی عبارت بھی نقل کر دی لیکن میری طرح آپ کی حیرت کی بھی کوئی انتہا نہ رہے گی جب دیکھیں گے کہ یہ عبارت مصطفیٰ کی تذکرہ ہندی کے خاتمہ کی ہے۔ صرف کہیں کہیں ہلکا سا اختلاف کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

خاتمہ تذکرہ ہندی مصطفیٰ

خاتمہ تذکرہ مسرور

برضمیر آئینہ نظیر مہر ان گوہر معانی مخفی... نہ مانکہ مولف اس

برضمیر آئینہ نظیر مہر ان گوہر معانی مخفی... نہ مانکہ مولف اس

تذکرہ غلام ہمدانی ولد ولی محمد... کہ مصطفیٰ

بیاضی ”صبح ازل“ شیخ پیر بخش مسرور ولد حکیم حیات اللہ...

شہرت دارد و از سبب... نامساعدی زمانہ

کہ بہ تخلص مسرور شہرت دارد و از سبب نامساعدت روزگار

کجا فرصت آں داشت کہ تصحیح احوال... شہر اے سابق...

کجا فرصت آں داشت کہ تصحیح احوال شہر اے نامدار

پرداخت... اما کنوں کہ رہبری... مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر

پردازد لیکن رہبری علامہ ہر استاد غلام ہمدانی مصطفیٰ...

تذکرہ ما... صاف نمودہ و درست ساختہ...

ایں بیاض را... صاف نمودہ و درست ساختہ...

بطور بیاض تحریر یافتہ

بطور بیاض --- تحریر یافتہ

خاتمہ تذکرہ مسرور مضمون مولوی امیر احمد علوی (نگار) ص ۵

خاتمہ تذکرہ ہندی مصحفی (انجمن ترقی اردو) ۲۸۲

قطعہ تاریخ یہ ہے

سال اوچوں زخرد پر سیدم
 یک ہزار و دو صد سی و نہ نوشت
 دیکھا آپ نے! قطعہ تاریخ کا یہی ایک شعر ہے جو تمام گردش کر رہا ہے، مصحفی نے تذکرہ ہندی کے اختتام پر یہی قطعہ تاریخ لکھا (ملاحظہ ہو تذکرہ ہندی صفحہ ۲۸۲) مصحفی نے بیاض "نور ازل" کے اختتام پر بھی یہی قطعہ تاریخ لکھا (ملاحظہ ہو نگار صفحہ ۱۴۳) مصحفی کے لایق شاگرد مسرور کے تذکرہ کا بھی قطعہ تاریخ یہی ہے (ملاحظہ ہو نگار صفحہ ۵۴) معلوم نہیں جناب امیر احمد علوی اور جناب مشیر احمد علوی کے نزدیک اس کا کیا جواب ہو شاید یہ تو اردو ہیں لیکن اگر تو اردو تو نہایت دلچسپ حیرت ہے کہ نہ صرف مسرور کا قطعہ تاریخ مصحفی کے قطعہ تاریخ سے لڑ گیا۔ بلکہ خود مصحفی کا قطعہ تاریخ ان کے ایک قطعہ تاریخ سے لڑ گیا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول گیا کہ مسرور کے قطعہ تاریخ میں ہلکا سا اختلاف ہے اور یہ اختلاف ناگزیر تھا، مصحفی کا مصرع ہے:-

یک ہزار و دو صد و نہ نوشت

یہ تو ۱۲۰۹ھ ہوا، انھیں ۱۲۳۹ھ ثابت کرنا ہے اس لئے بڑی آسانی سے مصرع میں "سی" ٹھونس دیا گیا اور مصرع ہو گیا

یک ہزار و دو صد سی و نہ نوشت

مصرع ناموزوں ہو گیا، لیکن اس کا خیال نہ جناب مسرور کا کوروی تلمیذ علامہ مصحفی کو ہوا نہ مرتبہ تذکرہ جناب مشیر احمد علوی کو اور نہ فاضل مضمون نگار جناب امیر احمد صاحب علوی کو۔

مختار الدین احمد آرزو

نگار کے پُرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:- (۱۲۶ء) جنوری ۵۷- (۱۲۷ء) اپریل ۵۷- (۱۲۸ء) مئی ۵۷- (۱۲۹ء) جولائی تا دسمبر ۵۷ فی پرچہ- (۱۳۰ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل و اکتوبر) ۵۷ فی پرچہ- (۱۳۱ء) فروری و جولائی ۵۷ فی پرچہ- (۱۳۲ء) فروری و اکتوبر ۵۷ فی پرچہ (۱۳۳ء) فروری، مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۵۷ فی پرچہ- (۱۳۴ء) مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، نومبر ۵۷ فی پرچہ- منجر نگار

الکر جنگ چھڑ گئی تو؟

یہ ایک سوال ہے جو اس وقت دنیا کی ہر قوم کو مضطرب بنائے ہوئے ہے اور اس لئے ہم کو بھی اپنی جگہ غور کرنا چاہئے کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو ہندوستان کا کیا حشر ہوگا۔

اس مسئلہ کے متعدد پہلو ہیں بعض داخلی بعض خارجی اور ان میں سے ہر ایک مستقل گفتگو کا محتاج ہے۔ خارجی پہلو کی بحث میں ہم کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس وقت یورپ کی سیاسیات کا کیا رخ ہے، برطانیہ کا موجودہ پوزیشن کیا ہے، دنیا اس جنگ کے لئے کیا کیا تیاریاں کر رہی ہے، ہندوستان کی اہمیت آئندہ جنگ میں کیا ہو سکتی ہے اور اس پر حملہ کئے جانے کے کیا کیا اور کس طرح کے امکانات پائے جاتے ہیں۔ داخلی پہلو کی گفتگو میں ہم کو غور کرنا ہوگا کہ ہماری ملکی تحریکات کا کیا رنگ ہے، ہماری موجودہ پالیسی کیا ہے اس میں کسی تغیر کی ضرورت ہے یا نہیں، کن کن ملکوں کی طرف سے حملہ کا امکان ہے اور یہ کہ ہم بیرونی حملوں کی مدافعت کیونکر کر سکتے ہیں۔

ان تمام مسائل پر پروفیسر ادراکار نے ایک نہایت مفید و بسیط کتاب شائع کی ہے چنانچہ ہم پروفیسر ندکور کے نظریوں کو پیش کر کے ان پر ایک بسیط تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

آئندہ جنگ کب شروع ہوگی؟ اس آگ کے اشتعال کا سبب کیا ہوگا؟ اور ہندوستان پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا قطعیت کے ساتھ تو کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا، لیکن قریب قریب یقین کے ساتھ ہم کسی نتیجے پر ضرور پہنچ سکتے ہیں۔

برٹنڈرسل نے خوب لکھا ہے کہ عالمگیر جنگ کا خوف ہی اصل سبب عالمگیر جنگ کا ہے، لڑائی کے خوف نے اسلحہ سازی بڑھا دی ہے، اسلحہ سازی جنگ کے خوف کو بڑھا رہی ہے اور آخر کار یہی خوف ایک عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کر لے گا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں دنیا کی خاص خاص قوموں کا تین ہزار ملین پونڈ (تقریباً ۴۰ ارب روپیہ) ہلاکت بار اسلحہ جنگ کی تیاری پر صرف کرنا اس خوف کا کھلا ہوا ثبوت ہے اور اچ۔ جی۔ ویلز کی یہ پیشین گوئی کہ ۱۹۴۲ء میں جنگ شروع ہو جائے گی بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ جنگ اس وقت تک شروع نہ ہوگی جب تک دونوں فریق اس کے لئے طیارہ ہوں اور انگلستان جسے یقیناً ایک فریق بننا ہے ابھی تک طیارہ نہیں ہے اور اس کی یہ طیارہیں جنگ سے پہلے مکمل نہ ہو سکے گی اس دوران میں بعض ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ پچیس سال قبل ان سے دنیا میں آگ لگ جاتی لیکن شیر برطانیہ نے ان سب کو برداشت کیا اور سوائے غرائے یاد مہلا دینے کے کوئی جنبش نہیں کی۔

رہائن لینڈ میں جرمنی کے فوجی استحکامات، حبش پر اٹلی کا قبضہ، بحرِ روم میں برطانوی جہازوں پر حملہ، سنگھائی کے واقعات، یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ اگر برطانیہ چو کھی لڑنے کے لئے طیارہ ہوتا تو کبھی کی جنگ شروع ہو گئی ہوتی۔ تقریباً یہی حال وسطیورپ کی حکومتوں کا ہے اور وہ بھی جنگ کے لئے طیارہ نہیں ہیں۔ حبشہ کی مہم نے اٹلی کو کافی خستہ کر دیا ہے اور وہ بھی اس وقت تک جنگ کی ہمت نہیں کر سکتا جب تک اسپین میں جنرل فرانکو کامیاب ہو کر پوری طرح فاسسٹی اقتدار قائم نہ کر دے۔ اس کے لئے بھی ایک سال کی ضرورت ہے۔ رہا جرمنی سوائسکی تدابیر بھی ابھی تک بچتے نہیں ہوئیں۔ اس کی ہوائی طاقت اس میں شک نہیں بڑی زبردست ہے، لیکن وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ پہلے اسپین میں نازی و فاسسٹی اثر قائم ہو جائے تاکہ فرانس کو اس طرف سے دبا سکے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا مقصد روس ہے۔ جرمنی یہ چاہتا ہے کہ اس طرف تھوڑی فوج اور معمولی استحکامات کے ذریعہ سے برطانیہ و فرانس کو الجھائے رکھے اور دوسری طرف پوری قوت کے ساتھ روس پر حملہ کر دے اور چونکہ اس کے لئے اسے جاپان کی مدد حاصل کرنا ضروری ہے اس لئے جب تک چین کے ساتھ اس کا الجھاؤ ختم نہ ہو، جرمنی اپنے حقیقی ارادوں کی تکمیل کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ الغرض ان حالات کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنگ کا فوری امکان نہیں ہے لیکن سنگھ سے زیادہ یہ ملتوی بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس وقت تک برطانیہ کی جنگی طیارے بھی پوری ہو جائیں گی اور اِدھر جاپان و اسپین کے معاملات بھی طے ہو چکیں گے۔

رہا یہ سوال کہ جنگ کے آغاز کا بہانہ کیا ہوگا، سو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں، لڑنے کے سو بہانے ہاتھ آ جاتے ہیں۔ تاہم قیاس یہی کہتا ہے کہ روکریں اور شرقی سائبیریا جنگ کا اکھاڑا ہوگا۔

اس وقت زیکو سلو ویکیا کے درمیان سے جو سڑک موٹر کی نکالی جا رہی ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ جرمن فوجیں آسانی سے روکریں تک پہنچ سکیں۔ نقشہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس راستہ میں اگر کسی کی طرف سے مزاحمت ہو سکتی ہے تو وہ رومانیہ ہے، لیکن وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے مزاحمت کی تو کیا نتیجہ ہوگا، چنانچہ گزشتہ دسمبر میں جب شاہ رومانیہ ہٹلر سے ملکر واپس آیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ ہٹلر کی مخالفت نہیں کر سکتا کیونکہ یہودیوں پر اب رومانیہ میں بھی سختی ہونے لگی ہے اور بالکل فاسسٹی اصول پر فوجی تنظیم ہو رہی ہے۔ الغرض اس وقت یہ ابتدائی طیارے مکمل ہو جائیں گی تو جنگ کا آغاز ہوں ہوگا کہ اس طرف سے جرمنی اور

سائیریا کی طرف سے جاپان روس پر حملہ کرے گا اور اس طرح دو مختلف محاذوں پر بالشویک فوجوں کو کام کرنا پڑے گا اب دیکھنا یہ ہے کہ اس صورت میں فرانس کیا کرے گا۔ اول تو اس معاہدہ کی بنا پر جو روس و فرانس کے درمیان ہو چکا ہے، فرانس کو روس کی مدد کرنا ضروری ہے، دوسرے سیاسیات کا اقتضا بھی یہی ہے کہ فرانس، روس کا ساتھ دے، اس صورت میں برطانیہ اور اٹلی کا جنگ میں حصہ لینا ضروری ہو جائے گا یعنی برطانیہ کو فرانس کا ساتھ دینا ہو گا اور اٹلی کو جرمنی کا۔

برطانیہ اگر چاہے بھی تو وہ نیوٹرل نہیں رہ سکتا کیونکہ اس صورت میں سخت سوشلسٹ انقلاب کا اندیشہ ہے اور فرانس کا ساتھ دینا اس کے لئے ضروری ہے، رہا اٹلی سو یہ بات ظاہر ہے کہ نازی اور فاسسٹ عقاید دونوں متحد ہیں اور مسوئینی ہر ملکر کا ساتھ دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ بہر حال آئندہ جنگ میں ایک طرف روس، فرانس اور برطانیہ ہوں گے اور دوسری طرف اٹلی۔ جرمنی اور جاپان اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ساری دنیا میں یہ آگ بھڑک اُٹھے گی۔

اس موقع پر ہمیں اس سے بحث کی ضرورت نہیں کہ نتیجہ کیا ہو گا، بلکہ صرف یہ غور کرنا ہے کہ ہندوستان کا کیا حشر ہو گا؟

چونکہ ہندوستان، برطانیہ عظمیٰ کا حصہ ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ برطانیہ جنگ میں مبتلا ہو اور ہندوستان نیوٹرل بن جائے، علاوہ اس کے ہندوستان کا جائے وقوع ایسا نہیں کہ وہ حملہ سے بالکل محفوظ رہے۔ یہ تقریباً طے شدہ امر ہے کہ آئندہ جنگ میں جاپان اور اٹلی برطانیہ پر حملہ کریں گے اور برطانیہ پر حملہ کرنے کے معنی ہندوستان پر حملہ کرنا ہے۔

اٹلی کے لئے حملہ کی راہ بحر روم، مشرقی افریقہ و مشرق وسطیٰ ہے۔ لیکن اس کے لئے اٹلی بالکل طیارہ۔ اس وقت اس کی ۶ لاکھ سپاہ اور ہوائی جہازوں کی بڑی تعداد بحر روم کے سواحل پر ایٹریا اور حبشہ میں موجود ہے، لڑائی شروع ہوتے ہی ایک طرف اٹلی کے ہتھیار ہوائی جہاز ہندوستان کے مغربی سواحل تک پہنچ کر کراچی، بمبئی اور کوئٹہ پر آگ برسائے لگیں گے اور دوسری طرف اس کی آبدوز کشتیاں تجارتی جہازوں کو غرق کر دینا شروع کر دیں گی۔

ماہرین کا خیال ہے کہ اطالوی فوجیں پہلے سندھ یا گجرات میں اتریں گی اور یہیں سے وہ چاروں طرف پھیل کر قابض ہوتی جائیں گی۔ سندھ کی موزونی کا سبب یہ ہے کہ اس کے شمالی و مشرقی ریگستان نے اس کو ہندوستان سے علیحدہ کر دیا ہے جہاں سے صرف دور یلو سے لائن گزرتی ہیں ایک پنجاب کو دوسری گجرات کو۔ ان لائنوں کو نہایت آسانی سے بیکار کیا جاسکتا ہے اور یہاں کی آبادی جو کم بھی ہے اور غیر جنگجو بھی فوراً اطاعت قبول کر سکتی ہے۔

علاوہ اس کے خام پیداوار بندرگاہوں کی تعمیر کے لحاظ سے بھی یہ حصہ زمین بہت موزوں ہے۔

جاپان کا حملہ ہندوستان پر اگرچہ ناممکن تو نہیں لیکن دشوار ضرور ہوگا، کیونکہ آئندہ جنگ میں اس کی فوجیں ایک طرف ساہیوال میں مصروف رہیں گی اور دوسری طرف چین پر تصرف و اقتدار قائم رکھنے کے لئے بڑی تعداد میں رکھنا پڑے گی۔ برما کی حدود کی طرف سے بھی وہ اس وقت تک اقدام نہیں کر سکتا، جب تک وہ درمیانی حکومتوں کو مغلوب نہ کر لے، ان فرض وہ بری یا بحری تاخت تو فی الحال ہندوستان پر نہیں کر سکتا لیکن ہوائی تاخت ضرور کرے گا اور برما، ہندوستان اور فرانسیسی انڈیا کے خاص خاص شہروں پر بمباری کر کے برطانیہ اور فرانس کے دل میں دھڑکا ضرور پیدا کرتا رہے گا۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ہندوستان سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ برخلاف اس کے اس کا عین مقصود ہندوستان پر قبضہ کرنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سمرقند کی طرف سے آنے والی مٹھی بھر زر و رنگ والی قوم کے افراد نے کس طرح صدیوں تک ہندوستان پر حکومت کی، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ مغلوں ہی کی ایک شاخ (ترکوں) نے کیونکر مہراور مشرق اوقی پر عرصہ دراز تک اپنا ہلالی پرچم لہرایا اور اس لئے وہ اپنا حق سمجھتا ہے کہ جن ممالک پر زر و رنگ کی اقوام حکومتیں کر چکی ہیں وہاں اس کی حکومت بھی قائم ہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ محل شناس بھی ہے اور اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر قبل از وقت کوئی اقدام نہیں کرے گا۔

اب دیکھنا چاہئے کہ ان خطرات کا مقابلہ ہندوستان کیونکر کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج تک مصائب و خطرات کا مقابلہ کبھی دعا سے نہیں ہو سکا اور دنیا کی کوئی ریاضت، کوئی تپش یا ایسی نہیں جو حوادث کا مقابلہ کر سکے۔ اس وقت تک خدا جانے کتنے اولیا اور انبیاء پیدا ہوئے، لیکن جنگی تباہیوں کی مقاومت کے لئے وہ کوئی معجزہ پیش نہ کر سکے۔

مادی قوت کا مقابلہ مادی ذرائع ہی سے کرنا ہوگا اور اس حیثیت سے ہماری حالت بہت گری ہوئی ہے جس جنگی معلومات یا عسکری جرات و بسالت کا تعلق ہے ہماری یہ حالت ہے کہ دس فی صدی آبادی نے تو آج تک اسلحہ کی صورت ہی نہیں دیکھی اور ہزاروں ایک ایسا ہوگا جس نے کبھی بندوق کو ہاتھ لگایا ہو۔ اور تو اور ہمارے ہندوستانی سپاہیوں کو اب تک تو پچانوں کا کوئی علم نہیں ہے اور عہد حاضر کی میکائلی جنگ سے وہ بالکل ناواقف ہیں۔ گزشتہ جنگ میں فلینڈرس کے مقام پر سب سے پہلی مرتبہ یہاں ہندوستانی فوجوں کو معلوم ہوا کہ حقیقی جنگ کسے کہتے ہیں اور نیزہ کہ اس میں حصہ لینے کی ان کو کوئی تعلیم نہیں دی گئی۔

ہندوستانی فوجوں سے گزشتہ جنگ میں جو کلام لیا گیا اس کی داستان بہت دردناک ہے۔ کوہر اور سلسل بارش میں راتیں بسر کرنے کے بعد وہ خندقوں میں ٹھونس دئے جاتے تھے اس حال میں کہ کوئی تو پچانہ ان کی حفاظت کے لئے موجود نہ ہوتا تھا اور دشمن کا قریب ترین نشانہ وہی ہوتے تھے۔ سرچ لائٹ کی روشنی میں ان پر گولے آکر گرتے تھے،

ہم برسانے جاتے تھے، زہریلی گیسوں کا شکار ہوتے تھے اور مشین گنوں سے جو گولیوں کی بارش ہوتی تھی اس کا ہدف سب سے پہلے انھیں کو بننا پڑتا تھا۔ لیکن ان تمام تجربات کے باوجود اب تک ہندوستانی فوجوں کو جنگ کے خاص رموز سے ناواقف رکھا گیا ہے۔ پھر ان حالات میں اگر ہندوستان پر حملہ ہو تو یہاں کی فوجیں کس کام آسکتی ہیں؟ -

اطالیہ کی فوج کے مقابلہ میں ان کا وہی حشر ہو گا جو جاپانی افواج کے مقابلہ میں چینی سپاہیوں کا ہو رہا ہے۔ سب سے بڑا سہارا برطانوی افواج اور برطانوی عسکری سیادت کا ہے، لیکن فرض کیجئے کہ کل ایسے اسباب پیدا ہو جائیں کہ انگریز یہاں سے چلے جائیں، یا انگریزی فوجوں کو خود انگلستان کی حفاظت کے لئے چلا جانا پڑے تو کیا ہو گا؟ وہی جواب بھی بیان کیا گیا، یعنی یورپ کی جدید افواج کے سامنے ہماری دیسی فوجیں ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتیں اور سوائے آسانی سے جان دینے کے وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ علاوہ اس کے برطانوی قوت کا گھمنڈ بھی بڑی حد تک صحیح نہیں، کیونکہ برطانیہ کی فوجی دھاک صرف بحری قوت تک محدود تھی اور اب اس پر اعتماد کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہندو ق کے سامنے تیر و تمشیر پر۔

چارلٹن کہتا ہے کہ اب کسی ملک کا اپنی بحری قوت پر بھروسہ کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے، اسی کے ساتھ نارمن والٹن نے یہ حیثیت ماہر کے برطانیہ کو مشورہ دیا ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اب برطانیہ کی بحری قوت بھی قصہ پارینہ کا حکم رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب برطانیہ کو بحروم، بحر احمر، اور نہر سوئز کو چھوڑ دینا چاہئے، کیونکہ ان پر اقتدار قائم رکھنا نہ صرف غیر معمولی مصارف کا باعث ہے بلکہ دشوار بھی ہے اسی کے ساتھ وہ یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ فلسطین اور جزائر مالٹا و قبرص کو بھی چھوڑ دینا چاہئے۔

بریکسٹر جنرل گروز کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس وقت بحروم کے سوا حل پر فرانس اور اٹلی کی دو بڑی زبردست قوتیں پائی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک مشرق کے ساتھ ہمارے فوجی تعلق کو علیحدہ کر سکتی ہے اور مالٹا کا بحری مرکز (Naval base) کوئی کام نہیں دے سکتا۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جس وقت زیکو سلاویکیا کا جھگڑا حال ہی میں پیش تھا تو بحروم کے برطانوی بیڑے کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ مالٹا سے ہٹ کر اسکندریہ اور حیفہ چلا جائے تاکہ اطالوی بمباروں کی دسترس سے قریب نہ رہے اور بندرگاہ گرد مارا نہ ہو۔ پھر جو بیڑے متعین تھا وہ کسی غیر معلوم جگہ پر بھیج دیا گیا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر برطانوی مستعمرات اب اپنے بچاؤ کے لئے فوری تدابیر اختیار کر رہے ہیں اور برطانیہ کی قوت پر بھروسہ کرنے کے لئے طیار نہیں۔ چنانچہ شمالی افریقہ اپنے آپ کو بڑی مستعدی سے مسلح کر رہا ہے اور میکائلی طریقہ مرافعت کے لئے دس بلین پونڈ کی منظوری دیاں دی گئی ہے۔ جنرل اسمٹس نے اپنی ایک تقریر میں ظاہر کیا کہ ”شمالی افریقہ کو اس وقت لاکھوں کیا کروڑوں پونڈ کا بھی خیال نہ کرنا چاہئے اور اس کو ہر آئندہ خطرہ جنگ

کا مقابلہ کرنے کے لئے خود طیار ہونا چاہئے، ورنہ نتیجہ یہ ہو گا کہ کوئی غیر آئے گا اور اس پکے ہوئے پھل کو ہضم کر جائے گا۔ چنانچہ مسٹر پیرو اس وقت انگلستان میں اسلحہ خرید رہے ہیں اور افریقہ بھیج رہے ہیں۔

یہی حال آسٹریلیا کا ہے۔ وہاں بھی فوج کی تعداد ستر ہزار کی جا رہی ہے (حالانکہ وہاں کی کل آبادی ستر لاکھ)۔ ۵۰ ہزار جہاز امریکہ سے طلب کئے جا رہے ہیں۔ صناعتی مرکزوں کی حفاظت کے لئے مخصوص فوجی دستے مرتب ہو چکے ہیں، پلوں، کارخانوں اور خاص خاص مقامات کے تحفظ کے لئے انتظامات جاری ہیں، عورتوں کے دستے بھی طیارہ پر رہے ہیں اور زہریلی گیس سے بچنے کے طریقے بھی اختیار کئے جا رہے ہیں۔

ہندوستان یا فلسطین میں بھی مزید چھ ڈویژن (۵۰۰۰ سپاہیوں کی جمعیت) کا اضافہ زیر غور ہے اور غالباً اسی بناء پر کہ جنگ کے وقت آسٹریلیا وغیرہ سے کسی مدد کی توقع نہیں کی جاتی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ چھ ڈویژن اطالوی سیلاب کا مقابلہ کر سکیں گے؟

برطانوی قوت پر بھروسہ نہ کرنے کے دو بڑے سبب ہیں، ایک تو یہ کہ برطانیہ فی الحقیقت اب ہندوستان کی مدد کر ہی نہیں سکتا، اس کی وہ اُلجھنیں جو خود انگلستان سے متعلق ہیں اور جن کو موجودہ مغربی سیاسیات نے بہت زیادہ پیچیدہ کر دیا ہے اس کی اجازت نہیں دے سکتیں کہ وہ ہندوستان ایسے دور دراز ملک کی طرف پوری توجہ کر سکے دوسرے یہ کہ اب جنگ کی کامیابی کا انحصار پیشہ وریا ملازم سپاہیوں پر نہیں ہو سکتا، اب ضرورت ہے کہ ہر ملک مسلح ہو اور اس کا ہر فرد ضرورت کے وقت عسکری خدمات انجام دے سکے۔ گھر کی حفاظت کا جذبہ جیسا خود گھر والے کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے، نوکر کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتا، انگریز سپاہی ہندوستان کی سرزمین میں ہندوستان کے بچانے کے لئے کبھی اس جوش سے نہیں لڑ سکتا جو ہندوستانی سپاہی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ پھر اگر واقعی ہندوستان زندہ رہنا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ انگلستان کی مدد پر بھروسہ کر کے خاموشش بیٹھ رہا جائے، بلکہ خود اس کو اپنی فوجی تنظیم بالکل جدید اصول پر کرنا چاہئے جس کی تفصیل ہم آئندہ اشاعت میں بیان کریں گے۔

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۱۹۳۷ء - نومبر ۱۹۳۳ء - جنوری و اپریل تا ستمبر - نومبر و دسمبر ۱۹۳۵ء - جون ۱۹۳۵ء
مئی و اگست ۱۹۳۶ء - فروری - دسمبر ۱۹۳۷ء کے نگار کے پرچے جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں، دفتر کو
مینجر نگار - لکھنؤ
اطلاع دیں۔

مکتوبات نیاز

گرامی جناب ، والا نامہ کل شام کی ڈاک سے ملا۔ وقت نہ تھا اور نہ اسی وقت جواب دیتا، آج صبح سے اس فکر میں ہوں کہ میاں صاحب کے آستانہ تک پہنچنے کی کیا تدبیر اختیار کروں۔ آپ کہیں گے اس میں تدبیر کی کیا ضرورت ہے۔ بارگاہ میں اطلاع کرائی اور جا کر قدمبوس ہو گئے۔ بالکل درست، لیکن اس گستاخی کی ہمت کیونکر پیدا کروں۔ میری ہر ہر سانس آلودہ گناہ، ان کے جسم کا ریشہ ریشہ مریم پناہ! اگر انھوں نے برہم ہو کر کوئی بددعا دیدی (گو اس کا امکان کم ہے) تو سمجھئے پانی سر سے گزر گیا اور اگر دعا دی (جس کا امکان زیادہ ہے) تو تازی پڑھتے پڑھتے مر گیا، چلئے، چھٹی ہوئی۔ ان کے ساتھ آپ کی عقیدت کے جو اسباب بھی ہوں مجھے معلوم نہیں، لیکن میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وہ صوفی بھی ہیں اور شمس العلماء بھی۔ دنیا کو ایک صوفی ہی سے پناہ نہیں مل سکتی، چہ جائیکہ وہ شمس العلماء بھی ہو۔ سانپ اور وہ بھی کالا! معاذ اللہ!

نہ بدرجستہ شرار و نہ بجا ماندہ رما د

سو ختم لیک ندانم بچہ عنوانم سو خست

بہر حال خلاصہ یہ ہے کہ وہاں حاضری دینا میرے امکان سے باہر ہے۔ میں ان کے آداب سے نا آشنا، وہ میری آزاد روی سے ناواقف۔ وہ حافظ کے ساغر سے کو بھی جام کوثر سمجھنے والے، میں کوثر و سلسبیل سے بھی جواز بادہ کی تاویل کرنے والا، میرا اُن کا کیا میل!

کچھ عرصہ ہوا اُن کے ایک اور معتقد مجھ سے آکر ملے اور دیر تک مدح سرائی کے بعد کہنے لگے کہ مرن میا نصبا کی دُعا سے میرا تبادلہ ایک دوسرے دفتر میں ترقی کے ساتھ ہو گیا ہے، میں سُنکر خاموش ہو رہا، لیکن تکلیف بہت ہوئی۔ اتفاق دیکھئے کہ دوسرے ہی دن وہ اپنی اصلی جگہ پر واپس کر دئے گئے۔ میں نے اُن سے سبب دریافت کیا تو دبی زبان سے کہا کہ کسی وجہ سے میا نصبا صاحب ناخوش ہو گئے تھے۔ پھر بتائیے کہ جس شخص کا ”غزوہ ناہید“ اس طرح دفعتاً ”قہر مرخ“ میں بدل جائے۔ ایسے ”قہرمان تقدس“ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بس ادب معافی چاہتا ہوں۔

قبلاً آرزوئے من مقصدِ حقیقہ من -

گرامی نامہ پہنچا۔ اس دل پرسی کا شکریہ کیونکر ادا کروں۔ وہ الفاظ کہاں ڈھونڈھوں جو میرے جذبات کے آئینہ دار ہوں۔ خاموشی کی بلاغت کا قایل ہوں، لیکن - ”یہ حوصلہ ضبط کہاں سے لاؤں۔“
میں اچھا ہوں اگر مطلق زندگی کو ”اچھا“ کہہ سکتے ہیں لیکن روح جس دور سے گزر رہی ہے وہ یہ ہے:-

بر طاق گزار خواہ در خاک آفسگن

ما شبیشہ سرنگون مے رنجتہ ایم

حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ یہاں شیشے میں نتھار ہی کیا کہ خالی کیا جاتا۔ اس لئے سوال یا س و نا امید کی کا نہیں بلکہ نا اہلیت و عدم استحقاق کا ہے۔ امید کے اسباب ہی نہیں تو نا امید کی کسی۔

اس سے زیادہ خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ کچھ زمانہ آپ کی معیت میں بسر ہو۔

اے خوشادقے کہ صرف راہ استغنا شود

لیکن ایسے وصل سے احتراز ہی اچھا جو ”تابِ مہجوری“ چھین لے، آنے کو تو آپ کے پاس آجاؤں، لیکن واپس آکر کیا حال ہوگا۔ اس کا خیال بھی جائگہ اڑ ہے۔

میرے لئے یہ احساس کیا کم فخر ہے کہ

ہر کہ رو سوئے تو دارد بہ جہاں قبلاً ناست

دنیا میں آپ کا کہلاتا ہوں اور ساری دنیا اپنے آپ میں پاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔

ایام دولت مستدام !

مکرمی -

کچھ نہ پوچھئے کہ یہ خبر سن کر دل کی کیا حالت ہوئی۔

خورشید خرامید و فروغ بنظر ماند

مرحوم کی صحت پر بھی دنیا لٹک کر تکی تھی اور اب ان کی موت پر بھی رشک کرے گی۔ مجھے کیا میں سمجھتا ہوں کسی کو بھی علم نہ تھا کہ وہ غلط قلب میں مبتلا ہیں۔ وہ خود تو یقیناً جانتے ہوں گے، لیکن میں نے آج تک ان کی زبان سے کبھی اس کی شکایت نہیں سنی۔ وہ موت کی آغوش ہر وقت کھلی ہوئی دیکھتے تھے، لیکن حرکت و عمل کا یہ عالم تھا گویا کبھی مرنا ہی نہیں۔

آخری وقت ان سے یہیں لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی، وہی کس بل، وہی عزم و ارادہ، وہی اضطرابِ کار،

وہی جذبہ اقدام۔ ہنس کر پوچھنے لگے ”آج کل کیا کر رہے ہو“ میں نے کہا ”کچھ نہ کر سکنے کے احساس کو تیز تر کر رہا ہوں“ کہنے لگے ”یہ تو بڑی بات ہے“ میں نے عرض کیا کہ ”ایسی اچھی بات ہے کہ جواب نہیں“۔ ہنس پڑے۔ پھر دیر تک اپنی جدید تصنیف کا ذکر کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے بلند انسان سچے، آپ کی دعائے مغفرت سے زیادہ بلند۔

بندگان عالی۔ ثنوی مولانا روم کے متعلق میری رائے آپ سے کیا ساری دنیا سے مختلف ہے۔ نظم و زبان کے لحاظ سے اس کا کوئی پایہ نہیں اور معنوی حیثیت سے بھی مجھے اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ کہانیوں کے ذریعہ سے اخلاق کا درس دینا بڑی پرانی چیز ہے اور ہر قوم کے لٹریچر میں اس کا وجود پایا جاتا ہے، لیکن وہ کتابیں جو کہانیوں کو حقیقت کے رنگ میں پیش کرتی ہیں میرے نزدیک سخت مضرت رساں ہیں اور انھیں میں سے ایک ثنوی مولانا روم بھی ہے آپ دیکھیں گے کہ جتنی حکایتیں اس کتاب میں نظر آتی ہیں انھوں نے عوام کیا بعض خواص کی نگاہوں میں تاریخی اہمیت حاصل کر لی ہے اور اس طرح ہمیں واہمہ پرست بنانے میں اس کتاب نے بھی بڑی مدد کی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس میں جن روایات و احادیث سے استناد کیا گیا ہے وہ بھی سب کی سب موضوع و صنعت ہیں اور ایسا ہونا لازم تھا کیونکہ جب تک صنمیاتی رنگ نہ پیدا کیا جاتا جاہلوں کے لئے اس میں دلچسپی پیدا ہوتی لیکن کیا دلچسپی ”افادیت“ سے زیادہ مہتمم بالشان چیز ہے۔ بہر نوع میری رائے میں یہ یکسر تخریبی لٹریچر ہے اور اس کا مطالعہ کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔

رہ گیا تصوف، سو اس میں شک نہیں کہ وہ اس رنگ سے خالی نہیں، لیکن ایک (readable) چیز ہونے میں مجھے بہت شک ہے کیونکہ اس میں نہ خیال کی گہرائی ہے نہ انداز بیان کی گیرائی۔ اگر اس میں تاریخی ہستیوں کے متعلق غلط بیانی سے کام نہ لیا جاتا، بلکہ بڑے تفصیل افراد و اوقات عمومی طور پر محض مثالی انداز سے حکایتیں بیان کر دیتیں تو اس زہر کا نقصان بہت کم ہو جاتا۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ وہ ادبی خصوصیات کے لحاظ سے مطالعہ کے قابل ہے اور نہ معنوی خوبیوں کی حیثیت سے۔ سعدی کو میں ان سے بہت بلند سمجھتا ہوں اور عطار کو ان سے زیادہ دلچسپ۔ اور سچ پوچھئے تو مجھے عارفی بھی ان سے بہتر نظر آتا ہے۔

زبان و خیال دونوں کی تکمیل اگر آپ کو دیکھنا ہے تو بیدل کی حکایتیں پڑھئے :-

ایک شخص نے کسی سنان مزا پر شمع و پروانہ کو دیکھا، پروانہ کی حالت شمع کے گرد یہ تھی :-
کمی گشت بیتاب گرد سرشش پر افشاں تراز دود بال و پرشش

زبس پکیرشس جا بجا سوختہ
زہر عضو بوسید اعضائے شمع

زخود ہم چرانا نے اندوختہ
سراپاش داغ و سراپائے شمع

پردانہ کی یہ بتیابی، یہ سوزانی دیکھ کر اس شخص نے پوچھا:-

نیائی چسدا جانب انجمن
زہر گوشہ گل کردہ بارغ و گھر
نظر آگنی عرض حقن ست و مے
چراغے کہ سوز و بہ ویرا نہا

کہ فرش ست صدر رنگ و شمع و لگن،
زہر جام، تاباں پر بارغ و گھر
نفس تاشی حروف چنگ ست و مے
و بال ست بر بال پر و انہا

اس کا جواب پردانہ نے جس انداز سے دیا وہ بھی ملاحظہ ہو:-

پرافشا ند پردانہ بقیہ دار
کہ پردانہ را کار با جمع نیست
بہر جا چراغے بزا فروختند
محال ست بی طاقت سوختن،
بہ ویرانہ گرد عا حاصل ست

بروں ریخت از پردہ مشتے شرار
مرادے جز اندیشہ شمع نیست
دو عالم بہ چشم ترش سوختند
کمند فرق ویرانہ از انجمن
کہ از ذوق آرایش محفل ست

مولانا روم کے کلام میں بخود ہی ضرور پائی جاتی ہے، لیکن (Climax) اس میں بھی نہیں ہے۔
بیدل کے سے ٹکڑے اس کے یہاں کہاں؟

جی ہاں وہ جج سے واپس آگئے ہیں اور اچھے ہیں۔ میں بھی ملنے گیا تھا، صورت تو ان کی بہت بدل گئی، سیرت کا حال معلوم نہیں لیکن سنا ہے کہ اپنے نام کے ساتھ حاجی نہیں بلکہ الحاج کا اضافہ پسند فرماتے ہیں آپ کے لئے کچھ تحایف تو ضرور لائے ہیں، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ علاوہ آبیہ زمزم اور خاک شفا کے کوئی کام کی چیز بھی ان میں شامل ہے یا نہیں؟

میں نے وہاں کی سیاسیات کے متعلق کچھ سوالات ان سے کئے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہاں وہ خاص جج کرنے گئے تھے اور جو چشم حقیقت انہوں نے کراچی کے ساحل پر کھولی تھی، وہ وہاں بھی بدستور کھلی رہی۔ اللہ، اللہ، کیا مرتبے ہیں۔ سچ ہے

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

بندہ نواز - جس بحث کو آپ نے اٹھایا ہے، خدا کرے اس کا انجام بخیر ہو، لیکن مجھے امید نہیں رہے پہلی اصولی غلطی تو یہ ہی ہوئی ہے کہ آپ نے اپنی حجت کی بنیاد ”لا اکراہ فی الدین“ پر قائم کی ہے، حالانکہ اسکے جو سنے آپ نے بتائے ہیں اس کی تردید تاریخ کے متعدد واقعات سے ہوتی ہے۔ ذرا غور تو کیجئے اس کا مفہوم کہیں یہ تو نہیں کہ ”دین میں اکراہ پیدا ہوتے ہی دین غائب ہو جاتا ہے۔“

مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ ان کا مذہب تشدد سے نہیں پھیلا آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ قرونِ اولیٰ میں کسی شخص نے اسلام اختیار ہی نہیں کیا کیا واقعات جنگ و حرب کو آپ جھٹلا سکتے ہیں اور کیا ان کا مقصود اشاعتِ مذہب نہ تھا؟ میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ مسلمانوں کی تمام لڑائیاں دفاعی تھیں اور انھوں نے جارحانہ اقدام کبھی نہیں کیا۔

بہر حال یہ استدلال بہت بوسیدہ ہے اور تاریخی حقائق کے مقابلہ میں اس کو پیش کرنا اپنی کمزوری کی اور تشہیر ہے۔

خالصاحب، دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشہ نہ ہوا

یعنی نہ غالب کے پرزے اڑے، نہ پرزے اڑانے کی کسی نے کوشش کی۔ میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس قوم میں اب کوئی جرأت باقی نہیں رہی۔ اور جب ایک قوم پست ہمتی کی اس منزل پر پہنچ جاتی ہے، تو اس کا ابھرنامحال ہوتا ہے۔ ابھی نہیں اگر آپ زندہ رہے (میں تو خیر نہ رہوں گا) تو آئندہ دیکھیں گے اس کا کیا حشر ہوا۔ زمانہ اور اس کے اصول وہی ہیں، لیکن ہم وہ نہیں ہیں۔

گل ہر گوشی ست لیکن صوبت بلبل نار ساست
ناہا کوتاہ انداد ست جرم گوشی نیست

گلبائے جعفری

جیسی سائز پر تقریباً ۱۵۰ اشعار جسے جناب نیاز صاحب نے ڈپٹی جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کے کلام سے انتخاب کیا ہے۔ اس انتخاب میں آپ کو ایسے اشعار بھی ملیں گے جن میں میر کا سوز و گداز بھی پایا جاتا ہے اور غالب کی رنگینی و شوخی بھی جو جناب اثر کا خاص رنگ ہے۔ ۵۰ کے ٹکٹ بھیج کر آپ حاصل کر سکتے ہیں۔
مینجر نگار - لکھنؤ

باب الاستفسار

مومن کے بعض حل طلب اشعار

(جناب سید ہادی تفسی صاحب - مراد آباد)

گزشتہ ماہ کے منگلار میں کسی صاحب کے استفسار پر آپ نے مومن کے بعض اشعار کا مطلب تحریر فرمایا ہے۔ میری رائے میں یہ سلسلہ بہت مفید ہے، کیونکہ مومن کہیں کہیں غالب سے زیادہ دقت پسند ہو گیا ہے اور ضرورت ہے کہ اس کے ایسے اشعار کو واضح کیا جائے۔ میں آج ذیل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں نہیں آیا۔ براہ کرم ان پر توجہ فرمائیے :-

- | | |
|--|-------------------------------------|
| ۱۔ حیرت حسن نے دیوانہ کیا گر اُس کو | دیکھنا خانہ آئینہ بھی دیراں ہوگا |
| ۲۔ دیدہ منظر آتا نہیں تجھ تک شاید | کمرے خواب کا بھی کوئی نگہباں ہوگا |
| ۳۔ آخر امید ہی سے چارہ حراماں ہوگا | مرگ کی آس پہ جینا شب بجر اں ہوگا |
| ۴۔ مجمع بستر مخمل شب غم یاد آیا، | طالعِ خفہ کا کیا خواب پریشاں ہوگا |
| ۵۔ چارہ جو اور بھی اچھا میں کروں گا ٹکڑے | پردہ شوخ جو پیوند گریباں ہوگا، |
| ۶۔ رحم فلک اور مرے حال پر | تو نے کرم اے ستم آرا کیا |
| ۷۔ سچ ہی سہی آپ کا پیماں دے | مرگ نے کب وعدہ فردا کیا |
| ۸۔ حوریں نہیں مومن کے نصیبوں میں جو ہوتیں | بتخانے ہی سے کیوں یہ بداخباں نکلتا |
| ۹۔ ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ | آگے مری نعش پہ وہ روگیا |
| ۱۰۔ میں بولوں تو چپ ہوتے ہیں اب آپ چھٹی تک | یہ بخش بیجا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا |

- ۱۱۔ کیا کہئے نصیبوں کو کہ اغیار کا شکوہ
سُن سُن کے وہ چپکا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
۱۲۔ مدعا غیر سے کہا تا وہ
سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا
۱۳۔ تو فلک مرگ ہم سے سب غافل
اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا
۱۴۔ بات شب کو اس سے منع بقراری پر بڑھی
ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھا سکتا تھا
۱۵۔ بل بے عیاری مدد کے آگے وہ پیاں شکن
وعدہ وصل آج پھر کرتا تھا اور شرابے تھا
۱۶۔ آگ کیا ہم کو لگا ئی ابر نے تیرے بغیر
وقت بارش اگلے خورشید تفت ہر ڈال تھا
۱۷۔ اس لب نازک کو برگ گل سے دیتے ہیں مثال
ہونٹا برگ لالہ تھے او نیل داغ لالہ تھا

(نگار) ۱۔ ”اُس کو“ سے مراد محبوب ہے۔ یعنی اگر آئینہ میں وہ اپنے آپ کو دیکھ کر خود اپنے حُسن پر دیوانہ ہو گیا جو بال یقینی بات ہے تو خانہ آئینہ ویران ہو جائے گا، یعنی آئینہ دیکھنا چھوڑ دے گا۔ ظاہر ہے کہ دیوانگی کی حالت میں جب آرائش و زیبائش کا خیال باقی نہیں رہتا تو آئینہ لیکر کون بیٹھتا ہے۔ ضمناً یہ بات بھی ظاہر کر دی ہے کہ آئینہ کی رونق اس کے حُسن ہی کی وجہ سے ہے اگر اس کے حُسن کا انعکاس نہ ہو تو وہ خانہ ویران ہے۔

۲۔ ”دیدہ نظر“ منادی ہے یعنی اسے دیدہ نظر، تجھ تک خواب نہیں آتا، شاید خواب کا بھی کوئی نگہ بان ہو گا جو اسے آنے نہیں دیتا۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب تک محبوب نہ اسے نیند آتا محال ہے۔ ادھر محبوب کا نگہ بان محبوب کو نہیں آئے دیتا اور ادھر خواب کا نگہ بان خواب کو نہیں آئے دیتا۔

۳۔ محرومی اور امید بظاہر ایک دوسرے کی منافی ہیں لیکن شاعر کہتا ہے کہ محرومی کا علاج بھی امید ہی ہے چنانچہ شب ہجران میں جیتے رہنا بھی صرف موت کی امید پر ہو گا۔ یعنی اگر موت کی امید نہ ہوتی تو شاید شب ہجران نہ کٹتی اور اس طرح محرومی کا علاج امید ہی قرار پایا۔

۴۔ شب غم ہمیں وہ زمانہ یاد آ گیا جب ایک ہی بستر مخمل پر ہم اور وہ دونوں جمع تھے اور اس یاد کی وجہ سے خفقہ طالعی یا محرومی کا زمانہ اور زیادہ تلخ ہو گیا۔

دوسرے مصرعے میں لفظ خواب محض اس لئے لایا گیا ہے کہ پہلے مصرعے میں لفظ مخمل موجود ہے۔ ”خواب مخمل“ مخمل کے رونگٹے کو کہتے ہیں۔

۵۔ اس شعر میں ”الجھن“ پرودہ شوخ“ سے پیدا ہوتی ہے، یہ ترکیب صفت موسوف کی نہیں بلکہ مضافات و مضافات الیہ کی ہے۔ یعنی اس شوخ کا نقاب یا اس شوخ کے در کا پردہ۔ مدعا یہ کہ اگر ہمارے پھٹے ہوئے گریبان میں، ماری تسلی کے لئے اس شوخ کے در کا پردہ پیوند کر دیا گیا تو ہم اور بھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے، کیونکہ ہم

اس کے پتہ وہ ہی کے تو مارے ہوئے ہیں۔

۶۔ پہلے مصرعے میں ”رحم فلک“ مضاف و مضاف الیہ ہے۔ اس مصرعہ کو استعجاب کے لہجہ میں پڑھئے اس طرح رحم فلک اور مرے حال پر !

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے ستم آرا تیرا ستم کرنا ہی میرے حال پر کرم تھا کہ اب فلک کو بھی مجھ پر رحم آنے لگا ہے۔

۷۔ آپ نے جو وعدہ ملنے کا کیا ہے وہ سچ سہی، لیکن موت نے تو وعدہ فردا نہیں کیا، ممکن ہے وہ آج ہی آجائے اسی وقت آجائے۔ اپنی مضمون کو تیر نے اس طرح ادا کیا۔

تیرے ایفاء عہد تک نہ جئے
عمر نے ہم سے بیوفائی کی

۸۔ اس شعر کی نثریں ہوں گی :- موت کے نصیبوں میں حوریں نہیں۔ جو ہوتیں۔ (تو) یہ بد انجام تبخانے ہی سے کیوں نکلتا۔

۹۔ شرعاً رونے والے کو جنازہ کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے شاعر کہتا ہے کہ اس کا جنازہ برا کر رونا محبت و ہمدردی کی بناء پر نہ تھا بلکہ بہانہ تھا اس بات کا کہ جنازہ کے ساتھ جانے کی تکلیف گوارا نہ کرنا پڑے۔ اس شعر کی نثریں ہوں گی :-

میں (اگر) بولوں تو آپ ابھی چپ ہوتے ہیں، یہ بخشش بیجا جیھی تک ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا۔

۱۱۔ جب اغیار کا شکوہ اُس سے کرتا ہوں تو وہ ایسا چپ ہو جاتا ہے کہ بس کچھ کہا نہیں جاتا۔ یہ بھی اپنے نصیب کی خوبی ہے۔ اغیار کا شکوہ دھوکے میں ڈالنے والا فقرہ ہے۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ”وہ شکوہ جو اغیار نے کیا۔“ لیکن یہاں مراد ”شکوہ اغیار کے خلاف“ ہے۔

۱۲۔ میں نے اپنا مدعا دشمن سے کہہ دیا تاکہ وہ (یعنی محبوب) یہ سمجھ لے کہ اب یہ مدعا سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور اس لئے اس کی مخالفت بیکار ہے۔

۱۳۔ اس شعر میں کیا اشکال ہے۔ پہلا مصرعہ یوں لکھئے :-

تو۔ فلک۔ مرگ، ہم سے سب غافل

۱۴۔ رات ہم بقیار تھے تو اس نے بقیاری سے باز رکھا اور کہا کہ اتنی بقیاری کیوں ہے ہم اسے التفات سمجھ کر اور بقیار ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ بات بڑھ گئی ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ اس کا بقیاری سے باز رکھنا بر بنائے ہمدردی تھا حالانکہ یہ سب کچھ خفگی کی بناء پر تھا اور اس نا سمجھی سے بات بڑھ گئی۔

۱۵۔ اس شعر میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ”وہ وعدہ وصل کس سے کرتا تھا“ اگر وعدہ مراد لیا جائے تو عیاری کا لفظ بیکار ہو جاتا اس لئے وعدہ وصل مومن ہی سے کر رہا تھا کہ ایک طرف دشمن کو یہ یقین دلایا کہ وہ مومن سے وعدہ وصل کر کے شرمندہ ہے اور دوسری طرف مومن کو یہ تسلی دی کہ پھپھلا وعدہ کر کے پورا نکر نے پر اسے بڑا حجاب ہو۔
۱۶۔ اس شعر میں کوئی اشکال نہیں۔ غالباً دوسرے مصرعے کی فارسی ترکیب نے الجھن پیدا کی ہے۔ اس کو یوں پڑھئے :- وقت بارش، اگلے خورشید تفت، ہر ژالہ تھا۔ خورشید تفت صفت ہے اگلے کی، یعنی سورج کی سی گرمی رکھنے والا اگلے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ”تم نہ تھے تو بارش نے اور یہاں آگ لگا دی یہاں تک کہ ہر ہر ژالہ ایک ”اگلے خورشید تفت“ کا حکم رکھا تھا۔

۱۷۔ پہلے مصرعے میں ”ہیں“ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہی ہونا چاہئے۔ مطلب یہ ہوا کہ لب نازک کو برگ گل سے مثال دیتے ہی معشوق نے غصہ سے ہونٹ چبانا شروع کئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ہونٹ برگ گل بن گئے۔
۱۸۔ در ان پر جو نیل پڑا تھا وہ داغ لالہ معلوم ہونے لگا۔ مدعا یہ کہ محبوب کے لبوں کو برگ گل کہنا ان کی توہین ہے۔

جرجی زیدان

جناب سید عبدالحی صاحب - حیدر آباد

مصر کے مشہور صنعت و مورخ جرجی زیدان کے حالات مطلوب ہیں۔ براہ کرم مختصر اقلیمند فرما کر ممنون کیجئے۔

(شمار) جرجی زیدان ۱۲ دسمبر ۱۸۶۱ء کو بمقام بیروت پیدا ہوا اور ۲۱ اگست ۱۹۳۷ء کو قاہرہ میں انتقال کیا۔
یہ ایک غریب مسیحی خاندان میں پیدا ہوا تھا اور ابتدائی تعلیم اس کی باقاعدہ نہ ہوئی تھی۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ خود اس کی ذاتی کاوش کا نتیجہ تھا۔ کچھ دنوں تک اس نے پرنٹنگ کالج میں تعلیم پائی اور وہاں سے دو اسازی کا سند حاصل کی۔ اس کے بعد یہ مصر چلا گیا اور ایک سال اخبار الزمان کے ادارہ میں کام کرتا رہا۔ ۱۸۸۲ء میں ایک ترجمان کی حیثیت سے سوڈان گیا اور وہاں سے بیروت واپس آکر ۱۸۸۶ء میں لندن گیا یہاں کچھ دن قیام کر کے مستقلاً قاہرہ میں مقیم ہو گیا۔ یہاں کچھ دن معلمی کی اور پھر کئی سال تک المقتطف (عربی رسالہ) کے دفتر میں ملازم رہا۔

اس نے اپنی سب سے پہلی تصنیف ”فلسفہ لسان“ پر ۱۹۲۷ء میں شائع کی۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں موجودہ مصر کی تاریخ دو جلدوں میں شائع کی اور چند کتابیں نصاب کی بھی لکھیں لیکن ان میں زیادہ کامیابی اسے حاصل نہیں ہوئی۔

۱۹۴۷ء میں اس کا سب سے پہلا تاریخی ناول ”آخرین ملوک“ شائع ہوا اور ۱۹۴۷ء میں اس نے اپنا مشہور رسالہ اہلال جاری کیا اور ہر سال ایک تاریخی ناول شائع کیا۔ اس کے ان ناولوں کو بھی بڑی شہرت حاصل ہوئی اور اہلال کی اشاعت بھی بہت وسیع ہو گئی۔ اس کے ۲۲ ناولوں میں سے سترہ ایسے ہیں جن میں عربوں کی ابتدائی فتوحات سے لے کر ملوکوں کے زمانے تک اسلامی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ باقی تین ناولوں میں اٹھارہ اور انیسویں صدی کے واقعات سے بحث کی ہے۔ یہ ناول بہت مقبول ہوئے اور مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ کیا گیا۔

اس کی تاریخی تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت ”تاریخ التمدن الاسلامی“ کو حاصل ہوئی۔ اسکی پانچ جلدیں ہیں اور زمانہ تالیف ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیان ہے۔ اس تاریخ کی بنیاد زیادہ تر مغربی مستشرقین کی تاریخیں ہیں اور اسی لئے اس میں کافی نقائص موجود ہیں۔ امین المدنی، یوسف طبشی اور مولانا شبلی مرحوم نے انتقادی رسائل اس کی تصانیف پر عربی میں شائع کئے۔

اس نے ایک کتاب تاریخ ادب عرب پر بھی شائع کی اور یہی غالباً اس کی سب سے پہلی تالیف تھی جو مغربی صوفیوں پر لکھی گئی۔ زبان کی کتابوں میں کوئی خاص ریسرچ نہیں پائی جاتی تاہم اس کے بیان کی سلاست ایسی خصوصیت تھی جس نے اس کی تصانیف کو بہت مقبول بنادیا۔ ہر چند بعض قدامت پرست علماء نے اس کی زبان میں بھی غلطیاں نکالی ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس نے ایک خاص اسٹائل لکھنے کا پیدا کیا اور اس دور کی عربی انشا پر داری کی تاریخ میں اس کو بڑا مرتبہ حاصل ہے۔

اس کے بعض مضامین کے مجموعے ”مختارات“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

فلسفہ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے تالیف کیا ہے۔ اصل قیمت ۷۵ روپے رعایتی ۱۲ روپے محصول علاوہ۔
مینجر نگار بک اینڈ پرنٹرز

کیا آپ کو معلوم ہے

سمندر کا پانی نمکین کیوں ہے؟

سمندر کا پانی فی الحقیقت وہ بارش ہے جو خشکی پر ہوتی ہے۔ مینہ زمین اور مسام رکھنے والی چٹانوں میں جذب ہو کر کیمیائی اجزاء کو (جو ان کے اندر پائے جاتے ہیں) گھلا دیتا ہے اور پھر یہاں سے وہ پانی ان تمام کیمیائی اجزاء کو لئے ہوئے چشموں اور دریاؤں کی صورت اختیار کر کے سمندر میں پہنچ جاتا ہے۔ یہی کیمیائی اجزاء جن میں بڑا حصہ نمک کا بھی شامل ہوتا ہے، سمندر کے پانی کو شور بنا دیتے ہیں۔

مختلف سمندروں میں نمک کی مقدار مختلف ہے۔ بحر شمال اور بحر اٹلانٹک میں نمک کی مقدار تین فی صدی ہے، بحر روم میں چار فی صدی اور بحر مدہ میں ۲۰ سے ۲۵ فی صدی تک۔ زمین کی قدیم ترین چٹانوں کی عمر، نمک کی اس مقدار سے معلوم ہوتی ہے جو ان سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ زمین کی قدیم ترین چٹانوں کی عمر ۲۰ کروڑ سال کی ہے۔

فاسرم کیا ہے؟

فاسرم ایک خاص نظام حکومت کا نام ہے جسے ۱۹ء میں مسولینی نے قائم کیا۔ یہ ایک قومی تحریک ہے جس کا مقصد اشتراکیت و اجتماعیت کو فنا کر دینا ہے۔ اس کی بنیاد قدیم رومہ کی اس تاریخ پر قائم ہے جب ملک کے ہر باشندہ کا فرض تھا کہ وہ حکومت کا وفادار خادم رہے اور نیز اس خیال پر کہ دنیا میں حکمرانی کا حق اہل رومہ ہی کو حاصل ہے۔ تجارتی انجمنوں کو توڑ کر فاسرم نے خود اپنی انجمنیں قائم کی ہیں اور نظریہ فاسرم یہ ہے کہ حکومت نام ہے مختلف صناعتی انجمنوں کے اتحاد کا نہ کہ افراد کا۔ ان انجمنوں کی تنظیم میں مزدوروں اور سرمایہ داروں دونوں کے نمائندے شامل ہوتے ہیں اور وہی تمام امور کا فیصلہ کرتے ہیں۔ انھیں انجمنوں کے نمائندے حکومت میں شامل

ہوتے ہیں اور اس طرح ایک پارلیمنٹ کی صورت قائم ہو جاتی ہے۔

فاسزم (Fascism) کا لفظ فیسز (Fasces) سے ماخوذ ہے۔

ڈنڈوں کا ایک گٹھا جس کے بیچ میں کلہاڑی بھی ہو، فیسز کہلاتا ہے۔ قدیم روم میں یہ نشان اقتدار سمجھا جاتا تھا جسے ایک آدمی جسٹریٹ کے آگے آگے لیکر چلتا تھا۔

سب سے زیادہ بارش کہاں ہوتی ہے؟

دنیا کا سب سے زیادہ مرطوب مقام آسام ہے جہاں گزشتہ ۲۵ سال سے سالانہ اوسط بارش کا ۵۰.۴۴ انچ ہے اس بارش کا سب سے حصہ جون، جولائی، اگست میں ہوتا ہے اور پہلے صرف جولائی میں ہو جاتا ہے۔

برف سفید کیوں ہوتی ہے؟

برف مجموعہ ہے بہت سے چھوٹے چھوٹے بلوری ذرات کا جن میں ہر طرف سے روشنی کا انعکاس ہوتا ہے اور یہ انعکاس سفیدی کی جھلک پیدا کر دیتا ہے۔ اگر روشنی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ مجموعہ ہے سات رنگوں کا (جیسا کہ تگونی نے بلوری ٹکڑے کے اندر دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے) لیکن چونکہ برف کے بلوری ذرات میں روشنی کا تجزیہ نہیں ہوتا اس لئے وہ سفید معلوم ہوتی ہے۔

آپ شیشے کے کسی شفاف ٹکڑے کو لیکر کچل ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شفافیت غائب ہو گئی ہو لیکن برخلاف اسکے برف کو خوب دبا کر اس کی ریل بنالیجئے تو وہ شفاف ہو جاتا ہے اور اسکی سفیدی غائب ہو جاتی ہے۔

انسان کے جسم سے کتنی گرمی پیدا ہوتی ہے؟

ایک تندرست جوان آدمی کے جسم سے فی گھنٹہ ۳۰۰۰ یونٹ گرمی پیدا ہوتی ہے۔ آپ یونٹ کے مفہوم کو دوسری طرح سمجھئے۔ یعنی اگر ۲۵ آدمی کسی معمولی کھانے کے کمرے میں بیٹھے ہوں، تو ان کے جسم سے جو گرمی پیدا ہوگی وہ اتنی ہی ہوگی جتنی ۱۶۰ ڈگری پر ۵۰ مربع فٹ واسے گرمتا ہے (Radiator) سے پیدا ہوتی ہے۔ گرمتا ہے مراد وہ آلہ ہے جو اپنے اندر سے گرمی پیدا کر کے کمرے کو گرم کرتا ہے۔

اسی لئے تھیٹروں، عکاس خانوں اور دوسری پلک عمارتوں میں ہوا کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے تاکہ مجمع سے پیدا ہونے والی گرمی تکلیف نہ دے سکے اور دم نہ گھٹے۔

کیا ہوائی جہاز وقت سے زیادہ تیز چل سکتا ہے؟

پہلے وقت کی رفتار کا مفہوم سمجھ لیجئے۔ وقت کا اندازہ آفتاب کے طلوع و غروب سے کیا جاتا ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہتے کہ زمین کی گردش سے۔ زمین کا دور ۲۴ میل ہے اور وہ ۲۴ گھنٹے میں اپنے محور پر ایک چکر پورا کر لیتی ہے گویا اس کی محوری گردش مغرب سے مشرق کی طرف ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ ہے اور یہی رفتار وقت کی ہوتی۔ جس وقت بحری طیارہ ۲۴ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگا تو بعض لوگوں نے کہا کہ ”اب وقت ایک جگہ ٹھہر کر گیا ہے۔“ بظاہر یہ بات بالکل شاعرانہ معلوم ہوتی ہے لیکن نہایت معمولی حساب داں بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر جہاز زمین کی حرکت کے خلاف مغرب سے مشرق کی طرف اسی رفتار سے چلے جو زمین کی ہے تو یقیناً وقت ٹھہر جاتا معلوم ہوگا، یعنی آفتاب کی بلندی اس کے لئے ایک ہی ڈگری پر رہے گی۔ لیکن اگر جہاز اپنے خط پر واز کا زاویہ بدل کر گدی قاصدہ کو کم کر دے تو وہ صرف ۶۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار پر وقت سے زیادہ تیز چل سکتا ہے۔

سب سے بلند عمارت کون ہے؟

تبت کی سرحد کی طرف ریاست کشمیر کا ایک مقام ہے جسے ہانگی کہتے ہیں، یہاں ایک معبد بودھ مت والوں کا ہے جو سمندر کی سطح سے ۲۰ میل کی بلندی پر واقع ہے یہاں سوائے اس معبد کے اور کوئی عمارت نہیں جو اس میں صرف سو پجاری رہتے ہیں اور یہاں سے باہر نہیں جاتے

بجلی کرکٹ پہلے کیوں ہوتی ہے؟

یہ شخص کا تجربہ ہے کہ پہلے اسے بجلی کی چمک دکھائی دیتی ہے اور پھر کرکٹ سناؤ دیتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ روشنی کی لہر آواز کی لہروں سے زیادہ تیز رفتار ہیں۔ روشنی کی رفتار ۱۸۶۳۲۶۰۰ میل فی سکنڈ ہے اور آواز کی رفتار ۵۰۰ میل فی گھنٹہ۔ گویا ہم بجلی کی چمک کو اسی وقت دیکھ لیتے ہیں جب وہ پیدا ہوتی ہے اور آواز کو کچھ وقت گزرنے کے بعد سنتے ہیں۔ اگر آپ بجلی کی چمک کے بعد ٹھہری لیکر شمار کریں کہ کتنی دیر میں کرکٹ کی آواز آئی ہے تو آپ اس فاصلہ کا اندازہ کر سکتے ہیں جہاں سے یہ آواز آئی ہے۔

”بگمائی“

تازہ ترین تاثر

ہمنشین! اہل جہاں کی تنگ دامانی نہ پوچھ
کھوچکا ہے عظمتِ تقدیس انساں کا ضمیر
خود تراشیدہ خیالوں پر لقیں کا ہے مدار
بن چکے ہیں وہم کے اڈے جہاں کے دشت و کوہ
کھا رہے ہیں اہل رانش، بدگمانی کے فریب
اک ذرا سی بات کو افسانہ کر دیتے ہیں لوگ
ہو رہی ہے وہم کے اجزائے تعمیر خیال

اس جہاں میں وہم کی پرچھائیوں کا راج ہے
بدگمانی کا عمل، رسوائیوں کا راج ہے

اس جہاں میں پھول کی پتی کو چھو لینا گناہ
اوس کی بوندوں سے دامن کو بھگولینا گناہ
چاندنی راتوں سے لذت یاب ہونا بھی گناہ
ایک پاکیزہ مسرت کا تصور بھی گناہ
آسمان کے چاند تاروں کا نظارہ بھی گناہ

وہم زائیدہ جنوں کی فتنہ سامانی نہ پوچھ
ڈھل چکا ہے وہم کے سانچے میں فطرت کا ضمیر
آدمی کا ہے تحنیل بدگمانی کا شکار
آدمی کو آدمی کے حال کی رہتی ہے ٹوہ
جھٹ چکا ہے ہاتھ سے فطرت کے دامن شکیب
لگ چکا ہے بدگمانی کا دل انساں کو روگ
ساغروں میں گھل رہا ہے بدگمانی کا کلال

حسن کے موضوع پر اشعار کہ دینا گناہ
آبشاروں کے کنارے، ہاتھ دھولینا گناہ
اک ذرا سی دیر کو بے تاب ہونا بھی گناہ
حسن کے عنوان پر غور و تفکر بھی گناہ
پھول کی معصوم ڈالی کا سہارا بھی گناہ

مجھل شعر و ادب میں بار پانا بھی گناہ
شعر پڑھنا جرم اور کچھ گنگنا بھی گناہ
انتہا ہے کہ احساسِ سرت بھی گناہ
مختصر ہے کہ پاکیزہ محبت بھی گناہ

اس جہاں میں "شعرو" بھی کس قدر ہی بد نصیب
فکرِ شاعر کو کوئی دلکش کھلونا چاہئے
زنگ و بو کے گستاخ میں شعر پاتا ہے فروغ
دل کی دھڑکن شعر میں جبت تک کہ بوجہ نہ بند
ہے محرک کی ضرورت دل کی دھڑکن کے لئے
لوگ شاعر کو سمجھتے ہیں امامِ خانقاہ
لوگ شاعر کو سمجھتے ہیں فرشتے کی مثال
اس جہاں میں زندگی کا نام ہے آوارگی

فطرتِ شاعر پہ اور پابندیاں فریاد ہے
یہ زمانہ کس قدر نا فہم اور جلاد ہے

ماہر القادری

غزل

تصور میں جو پھولوں کا سماں ہے
بہت سے دہریں و تاتل ادا ہیں
جوانی اور پھرتیری جوانی
نہ پوچھو شامِ تنہائی کا عالم

مرا انداز پر دردِ ماسر
بہ عنوانِ حدیثِ دیگران ہے

ماہر القادری

کلیسا

آ رہی ہے دور سے گرجے کے گھنٹوں کی صدا
 آہ یہ قاتل ترنم آہ یہ کافر سرود
 مرکزِ تہلیت پر حسن و جوانی جلوہ تاب
 سیکڑوں دل اک ہجوم شوق میں کھوئے ہوئے
 سیکڑوں معصوم بچے سیکڑوں پیر و جوان
 ایک ہی جا سیکڑوں دوشیزگان نازنین
 ایک جا سٹٹا ہوا سا اک جہان رنگ و بو
 نازنینوں کی دعائیں مہ جبینوں کے نیاز
 ماتھے میں انجیل سینوں میں مسلسل اضطراب
 اک کلیسا میں ہزاروں آئینہ رخ بلقالب
 صفحہ انجیل پر کھوئی ہوئی سی ہر نگاہ
 سیکڑوں دوشیزہ سینوں پر صلیبوں کے شاں
 انتہائے قدس میں ڈوبی ہوئی سی ہر نظر
 اک حریم قدس میں ہر بہتِ مریم سرنگوں
 آہ یہ معصوم منظر اُٹ یہ لاہوتی فضا
 اے کلیسا پاکی دامنِ مریم کی قسم
 عبرت دنیا کے نظاروں میں شامل تو بھی ہے
 سوز بھی قیری فضا سے قدس میں ہے ساز بھی
 دفعتاً تیری طرف کھینچتا چلا آتا ہے دل

ٹھہر جا اسے نہیں اس رہگذر پر ٹھہر جا
 ہر نفس محو عبادت ہر نفس صرف سجود
 ایک ہی سیلاب میں بہتا ہوا ہر شیخ و شاب
 سیکڑوں طوفاں کنا بحر میں سوئے ہوئے
 صفت بہ صفت پہلو بہ پہلو کارواں درکارواں
 ایک مرکز پر ہزاروں سیم تن زہرِ حبیب
 اک جگہ ٹھہرا ہوا سا کارواں رنگ و بو
 ایک آہنگ مقدس میں بلا کا سوز و ساز
 بہکی بہکی سی نگاہیں کھویا کھویا سا شباب
 ایک آغوش تجلی میں ہزاروں آفتاب
 دامنِ تہلیت میں سوئی ہوئی سی ہر نگاہ
 اک فضاے قدس میں لاکھوں فرشتے پر فشاں
 دامنِ مریم کا سایہ ہر سرِ معصوم پر
 لب پہ آیا تہِ مقدس آنکھ میں رنگِ فسوں
 یہ تکلم یہ ترنم یہ تقدس یہ دعا
 لڑکھڑاتے ہیں تیرے جادے پہ طاعت کے قدم
 آہ میری رہگذر کی ایک منزل تو بھی ہے
 کاش اس طوفانِ مین سن کے تو میری آواز بھی
 ایک طوفانِ ترنم میں بہا جاتا ہے دل

حُسن کی کلیاں چٹکتی ہیں تیرے گلزار میں
دل بھڑک اٹھتا ہے ان نغموں کی دھیمی آگ سے
دل یہ کہتا ہے یہیں صرف دعا ہو جاؤں میں
نالہ ہائے شوق کو صرف پریشانی کروں
درد کہتا ہے تیری آواز تجھ سے چھین لوں
سُن پس دیوار ہستی درو پیہم کی صدا
یوں وقار زندگی رسم عبادت میں نہ کھو
آہ اسے ساحل نشیں خمیا زہ طوفاں بھی دیکھ
معصیت بکتی ہے تیرے زہد کے بازار میں
چھوڑ دے اللہ یہ بے حس عبادت چھوڑ دے
زاہدان دہر کے سینوں میں لیکن دل نہیں،
یا خدا تو ہی بدل دے میرا عنوانِ حیات
(پروفیسر منظور حسین شورو (ام۔ اے))

زمزمے خوابیدہ ہیں تیرے ترنم زار میں
روح تھراتی ہے تیرے ہر مقدس راگ سے
جی میں آتا ہے کہ تیرا ہمنوا ہو جاؤں میں
آنسوؤں کے تار سے عرض گرا بخانی کروں،
شوق کہتا ہے کہ تیرا ساز تجھ سے چھین لوں،
بسترِ بہانیت سے راہوں کو اب جگا
درس دے انسانیت کا آدمِ بیدار کو
جادۂ عشرت سے ٹھکر حالتِ انساں بھی دیکھ
اہر سن آباد ہیں تیرے ملائک زار میں
اس خرابات کہن کے جام و مینا توڑ دے
داغ دارِ سجدہ ہے صدیوں سے آدم کی جہیں
کس قدر نا آشنا ہے درد و غم سے کائنات

غزل :-

کل داستاں ہماری دہرائیگا زمانا
منزل کو بھی تو ہم نے منزل کبھی دجانا
اب ہو سکے تو روکے آکر ہمیں زمانا
بتا ہے بنتے بنتے مشکل سے اک فسانا

کہتے رہے ابھی تک اپنا ہی ہم فسانا
رم خوردہ جنوں کی منزل کا کسا لٹکانا
دیرو حرم کی حد سے آگے نکل چکے ہیں
لٹتی ہے لٹتے لٹتے مدت میں اک جوانی

اسے شور اب یہ میرا دستور ہو گیا ہے،
ہر کشمکش میں ہنسنا ہر غم میں سکرا نا

پروفیسر منظور حسین شورو (ام۔ اے)

غزلیات :-

سکندر علی وجد حیدر آبادی

پھر ترے گیت گارہا ہوں میں ساری دنیا پہ چھپا رہا ہوں میں
 ہو چکی صنم، نیند کے ماتے! کب سے جا دو جگا رہا ہوں میں
 دیر سے یاد آ رہی ہے تری کیا تجھے یاد آ رہا ہوں میں؟
 جب سے ٹھکرا دیا نشیمن کو برق پر مسکرا رہا ہوں میں
 سن رہا ہوں صدا زمانے کی

ساتھ لے وجد، آ رہا ہوں میں! جب وہ سرور نظر آتا ہے
 ہر طرف نور نظر آتا ہے میں تو میخوار ہوں، تو کیوں ساقی!
 نشہ میں چور نظر آتا ہے میں ہی تنہا نہیں، دل کے ہاتھوں
 تو بھی مجبور نظر آتا ہے مے کے ساغر میں نرا پانی بھی
 عرق انگور نظر آتا ہے قرب سے ہاتھ اٹھایا میں نے
 تو بڑی دور نظر آتا ہے

خاک ساری کو چھپانے کے لئے
 وجد مغرور نظر آتا ہے

بھرتا نہیں ہے جی تجھے سو بار دیکھ کر بڑھتی ہے اور حسرت دیدار دیکھ کر
 صیاد کے سلوک پہ آنسو نکل پڑے طرزِ نوائے مرغ گرفتار دیکھ کر
 مایوس انتظار سراپا لہز گیا اشکوں پہ نورِ صبح کے آثار دیکھ کر
 تقدیر عشق صبح ازل جاگ سی گئی مجھ کو متاعِ غم کا خریدار دیکھ کر

تصویر اہل درد نگاہوں میں بھر گئی
 وجد سزائیں کی مستی کردار دیکھ کر

غزل:

ہنسنا کبھی کبھی کا بھی اب زہر خند ہے
ہوتا ہے وہم سا راجہاں درد مند ہے
جب وحشت مزاج تھیں ناپسند ہے
حیرت ہے تجھ کو کعبہ میں کیا شے پسند ہے
میرا مہتام شوق کچھ اتنا بلند ہے
دل ہر معاملے میں سکوں ناپسند ہے
ظالم! یہ کیا کہا! درمیخانہ بند ہے
میری بہار میرے گریباں میں بند ہے

دل تلخی حیات سے یوں درد مند ہے
صرف اپنے درد دل کی حقیقت کو جانچ کر
کیوں وحشت مزاج مجھے تم نے بخش دی
میں حسن دیر سے بھی ہوں زاہد! کنارہ گیر
پر واز جستجو کو بھی کوئی خبر نہیں
حسرت بہ صد گداز، تنابہ صد تپش
یہ رات، یہ بہار، یہ بڑھتا ہوا جنوں
دست جنوں کو فرصت جنبش تو دے کوئی

رکھا ہے نام اُس نے عدم اپنا سوچ کر
وہ بندہ نوجواں بھی بڑا ہوشمند ہے

عدم

اشعار کاوش حیدر آبادی

مگر اب قفس میں ہوں خندہ زن رہ و رسم برق و شرار پر
کہ زمانہ اشک بہا چکا میرے دل کی حالت زار پر
میں خزاں کی لاش کو لپچلا ہوں اٹھکے دوش بہار پر
کہ ہزاروں جلوے تڑپ رہی ہیں ہنوز راہ گزار پر
آنچل تمھارے رخ سے ہٹا یا نہ جائے گا
ہم سے تو دل کا حال چھپا یا نہ جائے گا
میں آستانہ دل پر بھی سر جھکا نہ سکا
میں درد دل کو سکوں آفریں بنا نہ سکا

نہ ملی چمن میں اماں مجھے رہ و رسم برق و شرار سے
نہ وہ فصل گل نہ وہ ابر تر نہ وہ سرخوشی نہ وہ دلکشی
وہ طلسم روئے جمال ہے وہ فسوں حسن خیال ہے
وہ نہ جانے کون تھا ہمنشیں جو نقاب لٹ کے گزر گیا
رشتک بہار، دید کے قابل سہی مگر
افشائے راز عشق میں رسوائیاں سہی
یہی نہیں کہ سوئے بزم دوست جان نہ سکا
غم حیات سے فرصت ملی نہ دم بھر بھی

وہ پوچھتے ہی رہے داستانِ غم، کاوش!
میں ان کو اپنا فسانہ مگر ستانہ سکا